www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آزادی کا امرت مہوتسو

आज़ादी का अमृत महोत्सव

G20 भारत 2023 INDIA

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

# خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اگست 2023

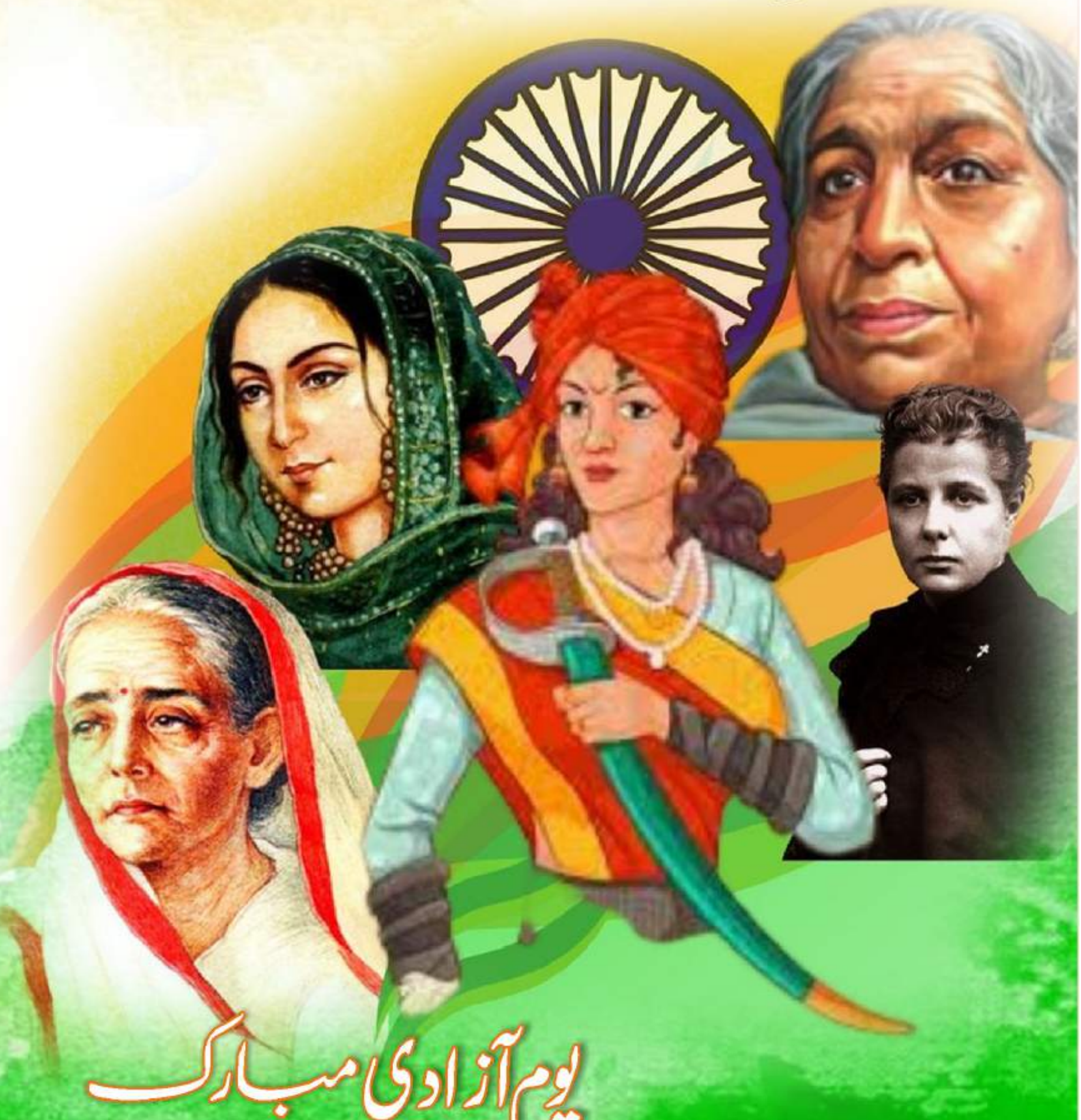

یوم آزادی مبارک

## ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

### قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

# ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

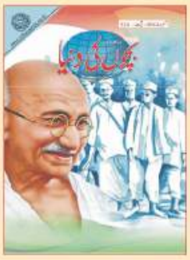

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

# اس شمارے میں


ادار یہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیت

حضرت محل: پہلی جنگ آزادی کی جری اور بہادر خاتون رہنما — ڈاکٹر درخشاں تاجور — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 9

جہان نسواں

غالب: تماشا اور تماشائی — پروفیسر نجمہ رحمانی — 10

لالی چودھری کے سفرنامے: ایک اجمالی جائزہ — دیپک بدکی — 14

پریم کو امر کرنے والی فن کارہ: امریتا پریتم — ڈاکٹر ریشا قمر — 21

نفیس بانو شمع کی خودنوشت — شاہد حبیب فلاحی — 26

ایران و ہندوستان کے لسانی وثقافتی روابط — اختر النساء — 28

نالۂ شب گیر میں عورت کا احتجاج — صوفیہ پروین — 31

محمد شفیع مونس کی شاعری کا مطالعہ — ناہیدہ شفیع — 36

تعلیم نسواں

خواتین کی تعلیم اور خواندگی کی ذمہ داری — ڈاکٹر شفاعت احمد — 39

خواتین کو بااختیار بنانے میں تعلیم کی اہمیت — ڈاکٹر محمد فیروز عالم — 43

حسن سخن

ڈاکٹر سمیہ ساجد، سیدہ تبسم منظور ناڈکر — 45

افسانہ

ساز وصل — ڈاکٹر سیدہ ایمن عبدالستار — 48

قصہ تیرے نام کا — نیلوفر سعدیہ — 54

صحت

وٹامن سی کی کمی اور خواتین — ڈاکٹر اشرف آثاری — 57

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 61



آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 8 اگست 2023

**مدیر اعلیٰ** : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

**مدیر منتظم** : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

**معاون مدیر** : ڈاکٹر مسرت

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

# مشعل

ہندوستان کو آزاد کرانے میں خواتین بھی پیش پیش رہی ہیں۔خواتین نے نہ صرف اپنے عزیزوں کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کیا بلکہ مردوں کے ساتھ ساتھ ہر طرح سے ان کا تعاون کیا۔کچھ خواتین نے اپنی شاعری کے ذریعے اور کچھ نے براہ راست جنگ میں حصہ لے کر اپنی بھرپور شراکت درج کرائی۔بیگم حضرت محل، مہارانی لکشمی بائی، عزیزن بائی، بی اماں، امجدی بیگم، بیگم حسرت، بیگم آزاد، کستوربا گاندھی، سروجنی نائیڈو، وجے لکشمی پنڈت کے نام نامی آزادی کی لڑائی میں سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے۔کچھ خواتین ایسی بھی ہیں جن کے ناموں سے ہم سب واقف نہیں ہیں لیکن انھوں نے اپنی کوششوں سے آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا۔

جنگ آزادی میں نواب زادیوں اور مہارانیوں نے ہی حصہ نہیں لیا بلکہ عوام وخواص کی وہ مائیں اور بیٹیاں بھی شامل تھیں جنھوں نے کبھی گھر کے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔غدر کی لڑائی میں جب آزادی کے شعلے بھڑکے تو ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی آزادی کے لیے جوش وجذبہ پیدا ہوا۔خواتین اپنے گھروں سے نکلیں اور بہ بانگ دہل انھوں نے آزادی کے لیے ہر قسم کی صعوبتوں کو بھی برداشت کیا۔آزادی کی اس لڑائی میں خواتین کے ساتھ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر کچھ نوجوان بھی شامل ہوئے اور غلامی کی بیڑیوں میں جکڑے ہندوستان کو آزاد کرانے کی ٹھانی۔ آہستہ آہستہ تحریک آزادی آگے بڑھتی گئی اور خواتین اس تحریک کا حصہ بنتی گئیں۔انھوں نے اپنے حوصلوں سے مردوں میں بھی آزادی کا جوش وجذبہ پیدا کیا۔انھوں نے نہ صرف جدو وجہد آزادی میں سرگرم رول ادا کیا بلکہ وہ تحریک آزادی میں اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر ہمیشہ کے لیے امر ہو گئیں۔ ان کی قربانیوں کو رہتی دنیا تک ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ان تمام کا نام سنہرے حرفوں میں لکھے جانے لائق ہے۔نئی نسل کو ان خواتین کی قربانیوں سے واقف کرانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شخصیت

# حضرت محل

## پہلی جنگ آزادی کی جری اور بہادر خاتون رہنما

ڈاکٹر درخشاں تاجور

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں جن خواتین نے قیادت کے فرائض انجام دیے ان میں ایک نمایاں نام بیگم حضرت محل کا ہے جو اودھ کے نواب واجد علی شاہ کی چہیتی بیگم تھیں ۔ ان کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی ۔ 1856 میں جب انگریزوں نے اودھ کی حکومت کو ضبط کر کے ، واجد علی شاہ کو جلاوطنی کی سزا دے کر کلکتے میں لے جا کر قید کر دیا تو پورے اودھ میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی سلطنت کی بازیابی کے لیے ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ ایک وفد انگلستان تک گیا، لیکن اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا۔[1] اودھ کی ضبطی کو مورخین نے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کا ایک اہم سبب قرار دیا۔[2]

1857 میں جب پورے ملک میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو انقلابیوں نے 5 جولائی 1857 کو واجد علی شاہ کے صاحبزادے برجیس قدر کو اودھ کے تخت پر بٹھا دیا۔[3] کیونکہ اس وقت برجیس قدر کمسن تھے اس لیے اودھ کی حکومت کی باگ ڈور بیگم حضرت محل نے سنبھال لی۔ ایسے وقت میں جب پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف غم و غصّے کی لہر تھی، بیگم حضرت محل امید کی شمع بن کر ابھریں۔ انگریزوں سے نفرت کا جذبہ ان کے دل میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جلد ہی

نفرت کی یہ چنگاری شعلۂ جوالا بن گئی۔ بیگم حضرت محل کی پالیسیاں عوام کا دل جیت چکی تھیں، اس لیے وہ ان کی قیادت میں اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہو گئے۔ انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے کے لیے ظلم و بربریت کی تمام حدیں پار کردیں۔4 اپنی پوری طاقت جھونک دینے کے باوجود وہ اس بغاوت کو کچل پانے میں ناکام ہو رہے تھے کیونکہ اس جنگ میں پورا اودھ کا علاقہ سر پر کفن باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس جنگ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کی بہت بڑی تعداد انگریزوں سے لوہا لینے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بیگم حضرت محل کی فوج میں بڑی تعداد میں خواتین بھی شامل تھیں جو جوش و خروش سے بھری ہوئی تھیں اور ملک کی آزادی کے لیے جان دینے کو تیار تھیں۔ ان کی بہادری کی مثالوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ خود بیگم حضرت محل بھی بہت بہادر تھیں۔ وہ اس جنگ آزادی کی قیادت بھی کر رہی تھیں اور مورچوں پر ہاتھی پر بیٹھ کر انگریزوں سے لوہا بھی لے رہی تھیں۔5 اس بات کی تصدیق ان کے عہد کے بیشتر وقائع نگاروں نے بھی کی ہے۔ اس بات کی شہادت کے لیے وہ خطوط بھی اہم ہیں جو واجد علی شاہ کی دوسری بیگموں نے تحریر کیے ہیں۔ سرفراز محل کے ایک خط کا یہ اقتباس مثال کے لیے پیش ہے:

> ''میں نہیں سمجھتی تھی حضرت محل ایسی آفت کی پرکالہ ہے خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں سے مقابلہ کرتی ہے۔ آنکھ کا پانی ڈھل گیا ہے اور اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔ عالم باغ پر بڑا مقابلہ رہا۔ احمد اللہ شاہ سے بھی حضرت محل مل لی۔ ہر دو نے بڑی جانفشانی دکھائی مگر قسمت کیا کرے۔6

حضرت محل کی بے خوفی اور بے جگری پر روشنی شیدا بیگم کا یہ خط بھی ڈالتا ہے۔ ان کی بے خوفی اور جی داری کو سراہتے ہوئے شیدا بیگم واجد علی شاہ کو لکھتی ہیں:

> ''آپ کے جانے کے ایک سال بعد وہ بلوائے عام ہوئے وہ وہ مصیبتیں آئیں جو خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منھ پھر پھر گئے بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر دیا کہ جس کی عورت ایسی مردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہے تو اس کا مرد کتنا بہادر شجاع ہوگا۔''7

ان کا ایک دوسرا خط بھی بیگم حضرت محل کی بہادری کی تصدیق کرتا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''یہاں نئے گل کھلائے جا رہے ہیں حضرت محل آپ کی محبوبہ سرکار سے جوڑ توڑ کر کے باغیوں کی سردار بنی ہے۔ نواب علی محمد خاں کے بہکانے میں آ گئی ہے شورا پشتی دکھا رہی ہیں دیکھیے کس کل اونٹ بیٹھے۔''8

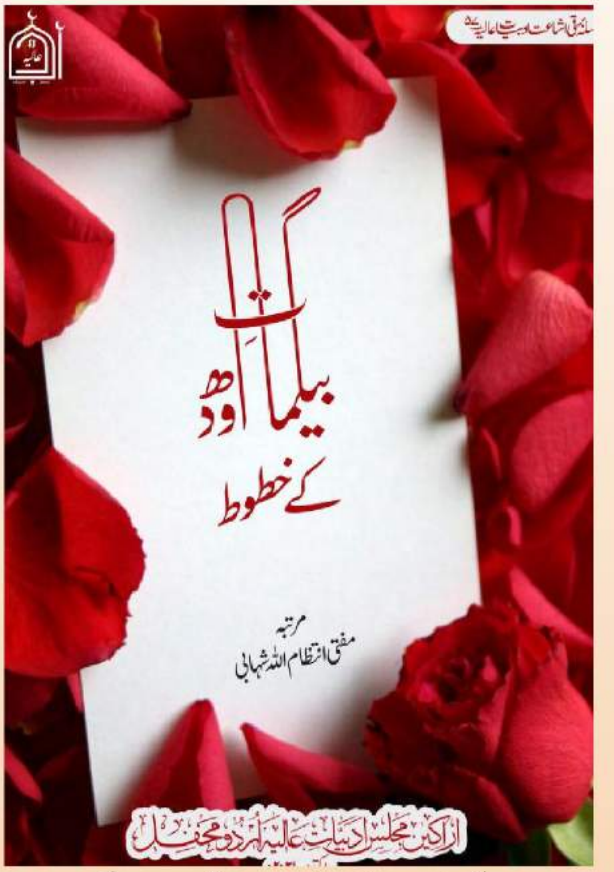


اس کی شہادت کے لیے وہ بیان بھی اہمیت رکھتے ہیں جو انگریزوں نے دیے ہیں یا اپنی کتابوں اور یادداشتوں میں لکھے ہیں۔ ٹائمس کے نامہ نگار رسل نے بھی ان کی تعریف کی ہے اور انھیں جری اور باعزت مرد کے خطاب سے نوازا ہے۔9 بیگم حضرت محل نے لکھنؤ میں بھی اور لکھنؤ کی سرحد سے باہر نکل کر بھی انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ انھیں احمد اللہ شاہ اور نانا صاحب کا بھی ساتھ ملتا رہا۔ بیگم حضرت محل نے مذہبی رواداری کی بھی بہترین مثالیں پیش کی تھیں اس لیے ان کی رعایا متحد ہو کر انگریزوں سے لڑنے مرنے کے لیے تیار تھی۔ انھوں نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوائے بھی۔ لیکن ان کا پالا مان سنگھ اور ان کے جیسے کچھ آستین کے سانپوں سے بھی پڑا جو بظاہر تو ان کے ساتھ تھے لیکن در پردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔10 جس کی وجہ سے ان کو اکثر مہموں

میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اکثر مورچوں پر بنے بنائے کام بگڑتے گئے۔ ان کے اِرد گرد کچھ ایسے منافق بھی تھے جنھوں نے تحریک کے دوسرے بڑے رہنما احمد اللہ شاہ سے انھیں ملنے نہیں دیا اور لگا تار ان میں کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ حالانکہ یہ دونوں ہی انگریزوں کے سخت ترین دشمن اگر یہ دونوں مل جاتے تو شاید صورتحال دوسری ہوتی۔ 11 اس کے باوجود لکھنؤ میں قبضے کے لیے انگریزوں کو سخت تصادم کا سامنا کرنا پڑا۔ مے جنڈی نے لکھا ہے کہ اس وقت ہر گھر سے مقابلہ ہوا۔ حوصلہ اور ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے باغی جگہ جگہ گھروں میں مورچہ بنائے ہوئے تھے اور انھوں نے ایک ایک انچ کے لیے انگریزوں سے خونریز جنگیں کیں۔ 12 خود بیگم حضرت محل نے جس ہمت اور دلیری سے انگریزوں سے مورچہ لیا اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس عہد کا ایک وقائع نگار معین الدین حسن خاں اپنی تصنیف ''خدنگ غدر'' میں لکھتا ہے:

> ''حضرت گنج کی طرف سے دلاورانِ انگلشیہ درِ دولت پر حملہ آور ہوئے قریب درِ دولت پہنچ کے سب فوج بادشاہی کو یقین شکست ہو گیا، روبفرار رکھا۔ یہ رنگ دیکھ کر حضرت محل بیگم صاحبہ محل سے بذاتِ خود بہ لباسِ مردانہ تلوار برہنہ ہاتھ میں لے کر باہر نکل آئیں۔ سپاہیان باقی ماندہ کو ایسے کلمات غیر آمیز کہے کہ ان کو جوش مردانگی آ گیا۔ بھاگنا موقوف کیا، پاؤں جم گئے، مرنا مسلم سمجھے دروازۂ محل بند کو کھول دیا۔ ایک توپ گراب سے بھری ہوئی دروازہ محل میں تیار تھی۔ ایک گولہ انداز نے اسے مہتاب دکھائی، اس نے بے تاب ہو کے اپنا کام دکھایا پھر شمشیر آبدار میان سے کھینچ کر دریائے آتشیں میں غوطہ زن ہوئے کھچڑی پک گئی، جوش میں پکنے لگی ایسی گھل مل کے تلوار چلی کہ طرفۃ العین میں کشتوں کے پشتے ہو گئے۔''13

14/ مارچ 1858 کو انگریزی فوجیں قیصر باغ میں داخل ہونے لگیں۔ شاہی محلات کے قریب پہنچنے پر بیگم حضرت محل نے اپنی مدد کے لیے خان علی خاں کو طلب کیا۔ اس نازک گھڑی میں انھوں نے بیگم حضرت محل کا ساتھ دیا اور چار سو سوار لے کر وہ انگریزوں سے اس وقت تک پامردی سے مقابلہ کرتے رہے جب تک انھیں خبر نہیں مل گئی کہ بیگم حضرت محل وہاں سے خیریت سے نکل گئیں۔ اس لڑائی میں خان علی خاں زخمی بھی ہوئے۔ جب انگریزوں سے فتح پانے کی تمام امیدیں معدوم ہو گئیں تو بیگم حضرت محل 16/ مارچ کو لکھنؤ سے باہر نکل گئیں۔ چار دن

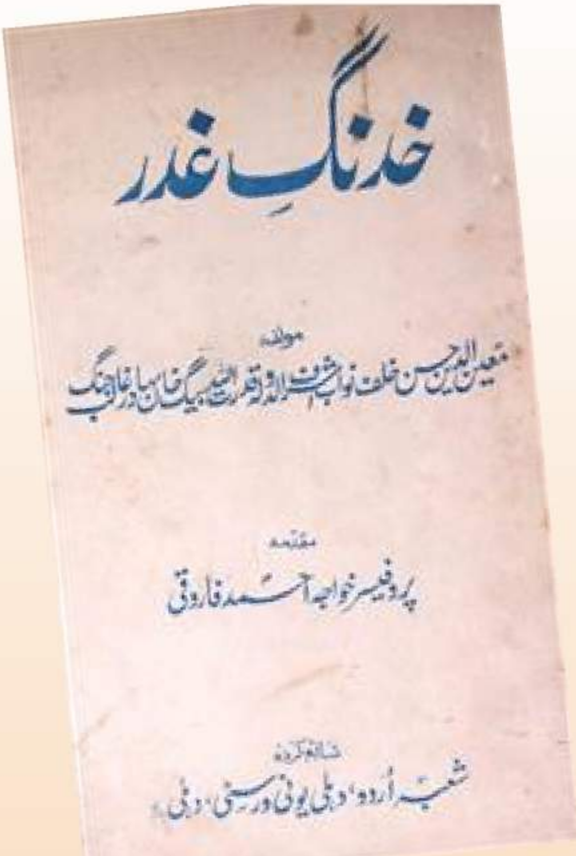


خیرآباد میں قیام کرنے کے بعد وہ بھدولی کے نواب علی خاں کے یہاں ٹھہریں۔ وہاں سے وہ راجہ ہردت سنگھ تعلقہ دار بونڈی کی درخواست پر معہ لشکر بونڈی چلی گئیں۔ 14 بونڈی میں انھوں نے کچی گڈھی میں قیام کیا۔ 15 راجہ ہردت سنگھ نے ان کی ہر ممکن مدد کی۔ وہاں انھوں نے حکومت قائم کی ناظم مقرر ہوئے۔ فرمان جاری کیے گئے۔ وہاں پر انھوں نے اپنی قوت مجتمع کی اور ایک مرتبہ پھر انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 16 لیکن انگریزوں کے بھرپور وسائل، نئی تکنیک کے ہتھیار اور گولہ بارود کے سامنے ان کی فوج نہیں ٹک پائی۔ انگریزوں کا پلڑا بھاری رہا۔ اس دوران انگریز ان سے مصالحت کی کوشش لگاتار کرتے رہے لیکن انھوں نے انگریزوں کی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ انگریزوں نے ان سے کہا کہ اگر وہ ان سے مل جائیں اور انقلابیوں کو کچلنے میں ان کا ساتھ دیں تو وہ ان کا مرتبہ بھی قائم رکھیں گے اور ان کے شوہر کے بھتّے کے ساتھ انھیں الگ سے پنشن بھی دیں گے تو اس بہادر اور غیور خاتون نے انگریزوں کا ٹکا سا جواب دے کر کہا کہ وہ ان سے صلح کرنے کی جگہ موت کو ترجیح دیں گی۔ 17 وہ جب بونڈی میں بھی پسپا ہو گئیں تو اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ نیپال چلی گئیں۔ ان کے بونڈی سے نکلنے اور نیپال میں پناہ لینے کی مکمل

تفصیل معین الدین حسن خاں نے اپنی تصنیف خدنگ غدر میں مندرج کی ہے۔ راجہ نیپال نے شروع میں تو انھیں میں آنا کانی کی لیکن بعد میں انھیں پناہ دے دی ۔ 18 وہاں پر بھی انگریزوں نے بار بار انھیں ہندوستان لوٹنے کی صلاح دی لیکن انھوں نے ان کی ہر گزارش کو ٹھکرا دیا۔ 19 ہندوستان پر قبضے کے بعد جب ملکہ وکٹوریہ کا اعلان شائع ہوا جس میں بہت سے وعدے کیے گئے تو بیگم حضرت محل نے اعلان شائع کر کے اس کا دندانِ شکن جواب دیا۔ 20 یہ اعلان یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ بہادر اور جری خاتون جنگ ضرور ہار گئی تھی لیکن ہمت نہیں۔

بیگم حضرت محل پھر تمام عمر ہندوستان واپس نہیں آئیں ۔ بیس سال تک انھوں نے نیپال میں کسمپرسی کی زندگی بسر کی ۔ 17/اپریل 1879 کو انگریزوں سے برابر کا مقابلہ کرنے والی ہندوستان کی اس بہادر بیٹی نے دیارِ غیر میں ہی اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ 21 اور اس طرح انھیں بھی دوسرے محبّ وطن قائدین تحریک آزادی کی طرح ؎

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اپنے ملک میں بھی انھیں ان کے شایانِ شان مرتبہ نہیں ملا ۔ 1857 میں آزادی صد سالہ تقریب کے موقعے پر مجاہدین آزادی کی جو فہرست مرتب کی گئی اس میں ان کا نام تک نہیں تھا بعد میں جب احتجاج ہوا تو 1862 میں صوبائی حکومت نے وکٹوریہ پارک کا نام ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا۔ 22 بعد میں ہندوستانی حکومت نے ڈاک ٹکٹ جاری کر کے بھی انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ 23 حق آزادی کے حصول کے لیے بیگم حضرت محل کی سرگرمیاں تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ انھیں یاد رکھنا اور ان کی قربانیوں کا احساس آئندہ نسلوں کو کرانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

### حواشی

1 تاریخ اودھ (حصہ پنجم) از۔ مولوی نجم الغنی خاں رامپوری، منشی نول کشور لکھنؤ صفحہ 274 تا 281

2 انقلاب اٹھارہ سو ستاون، از۔ پی سی جوشی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی 1998 صفحہ 23 تا 27

3 ''اٹھارہ سو ستاون''، از۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، رام پور رضا لائبریری، رام پور 2000، صفحہ 441

4 ''انقلاب 1857 تصویر کا دوسرا رُخ'' ترجمہ شیخ حسام الدین مقدمہ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، اتر پردیش اُردو اکادمی، نئی دہلی، 1982، صفحہ 50

5-6 ''بیگمات اودھ کے خطوط'' مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی، فاروقی پریس دہلی صفحہ 51-52

7 ''بیگمات اودھ کے خطوط'' مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی، صفحہ 55

8 ''بیگمات اودھ کے خطوط'' مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی، صفحہ 35

9 ''اوراقِ زرّیں'' از۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2017، صفحہ 108

10 1857 میں اودھ کا محاذ معاصر اُردو مآخذ کی روشنی میں، از۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور، پرنٹولوجی انک، نئی دہلی 2015، صفحہ 373 تا 376

11 اٹھارہ سو ستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے) مرتبہ۔ اقبال حسین، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی 2009 صفحہ 153

12 اٹھارہ سو ستاون (دہلی، میرٹھ۔ اودھ اور روہیل کھنڈ) از۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، صفحہ 488

13 ''خدنگ غدر'' از۔ معین الدین حسن خاں، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، 1972 صفحہ 124

14 ''خدنگ غدر'' از۔ معین الدین حسن خاں مرتبہ۔ خواجہ احمد فاروقی صفحہ 131 تا 134

15 اٹھارہ سو ستاون (دہلی، میرٹھ۔ اودھ اور روہیل کھنڈ) از۔ خورشید مصطفیٰ رضوی صفحہ 459

16 ''خدنگ غدر'' از۔ معین الدین حسن خاں، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی صفحہ 134-135

17 ''قیصر التواریخ'' (جلد دوم) از۔ سید کمال الدین حیدر، منشی نول کشور لکھنؤ 1879، صفحہ 334-335

18 ''قیصر التواریخ'' (جلد دوم) از۔ سید کمال الدین حیدر، صفحہ 340-341

19 ''شان اودھ''۔ بیگم حضرت محل، از۔ وسیم احمد سعید، ایم آر پرنٹرس، نئی دہلی 2006، صفحہ 125

20 ''شان اودھ''۔ بیگم حضرت محل، از۔ وسیم احمد سعید، صفحہ 92

21 ''شان اودھ''۔ بیگم حضرت محل، از۔ وسیم احمد سعید، صفحہ 132

22 ''شان اودھ''۔ بیگم حضرت محل، از۔ وسیم احمد سعید، صفحہ 234-235

23 ''شان اودھ''۔ بیگم حضرت محل، از۔ وسیم احمد سعید، صفحہ 197

□□□

**Dr. Darakhshan Tajwar**
C/O Mr. Imtiyaz Ahmad Abbasi (Advocate)
Saudagar Mohalla
Madarsa Chauraha
Gorakhpur 273005 (U.P.)

# شاعرات کے منتخب اشعار

امراؤ کیا کہوں کہ شب ہجر نیش غم
چبھتا رہا ہر اک رگ جاں میں سحر تلک

امراؤ

جدھر کے دیکھنے سے جان زار جاتی ہے
اسی طرف کو نظر بار بار جاتی ہے

امیر

تونے تو رہا کر ہی دیا زلف دوتا سے
ہم جان سے بھی جائیں تو اب تیری بلا سے

اہل

بسم اللہ جان عشق میں قربان کیجیے
مانند زلف دل نہ پریشان کیجیے

بسم اللہ

بچتا نہیں ہے کوئی بھی بیمار عشق کا
یا رب نہ ہو کسی کو یہ آزار عشق کا

بنو

بہار آئی ہے پھر رنگ دل ناکام بدلا ہے
ہوا بدلی مزاج بادۂ گلفام بدلا ہے

بدلا جان

شب بزم ملاقات میں ہر چند یہ چاہا
آنکھیں میں لڑاؤں کہیں اس رشک قمر سے

بہو بیگم

ہے منظور باجی ستانا تمھارا
گلہ کرتی ہے ہے جو دوگانا تمھارا

بیگم

بستی ضرور بچایئے اسباب ظاہری
دنیا کے لوگ دیکھنے والے ہوا کے ہیں

بستی

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا
یہ قصر لا جواب بنا اور بگڑ گیا

پارسا

سن کے میرا قصۂ غم ہنس کے کہتا ہے وہ شوخ
ہم نہ سمجھے کچھ کہ اس قصہ کا حاصل کیا ہوا

پری

ساتھ ہم لے گئے سرمایہ عدم کو اپنا
درد دل دیتے کسے سوز جگر کیا کرتے

پکھراج بیگم

آزادئ افکار سے جو بھی ہوئی محروم
سچ یہ ہے کہ اس قوم کو جینے کا بھرم کیا

زیب عثمانیہ

نہ کوئی راز داں اپنا نہ کوئی ہم زباں اپنا
دل پر داغ کے دم تک ہے عالم میں نشاں اپنا

بشیر النساء بیگم بشیر

ہے کائنات کے ہر ذرہ میں گہر ریزی
نگاہ فکر کو خود جستجو نہیں باقی

حیا لکھنوی

شمع امید جلا بیٹھے تھے
دل میں خود آگ لگا بیٹھے تھے

صفیہ شمیم

**(ماخذ: تذکرۂ قدیم شاعرات اردو، مرتب: ڈاکٹر اکبر حیدری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، 1996)**

پروفیسر نجمہ رحمانی

# غالب
## تماشا اور تماشائی

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآوے

یہ دنیا ایک تماشہ گاہ ہے اور ہم سب تماشائی۔ مگر تماشا یہ ہے کہ تماشائی خود بھی تو ایک تماشا ہے اور یہ جو

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہاں کسی کا کوئی کردار متعین نہیں ہے۔ ہر منظر کے ساتھ اداکار کا کردار بدلتا ہے۔ غالب کی زندگی بھی تماشاہ گاہ زیست کی انہیں نیرنگیوں کا مرقع ہے ایک ذہین، حسّاس، صاحبِ علم اور دنیادار شخص جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا۔ اور کون جانے اس کا وقت کون سا تھا یا ہوگا، اس کا کوئی وقت تھا بھی یا نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہر زمانہ ایک آزمائش ہی ہوتا ہے مگر غالب کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ جس نے اسے کردار کو کامیابی کے ساتھ نبھانے کا حوصلہ دیا۔ غالب کا مطالعہ ان کی خارجی و باطنی زندگی کے تضادات کے سبب ہر قدم پر دامن فکر کو کھینچتا ہے۔ آپ اپنا تماشائی بن کر خود کو اپنا غیر تصور کر لینا اور اپنی ذلت سے خوش ہونا ایک پیچیدہ نفسیاتی کیفیت ہے۔ کیفیتوں کو بہ عینہٖ بیان میں منتقل کر دینا ہے اور خود سے باہر، بلکہ اپنے آپ تک بھی اس کی رسائی ہو جانا ایک مشکل عمل ہے۔ اور غالب تو ہر قدم پر باطن و ظاہر، دل و دنیا کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک جانب درِ کعبہ وا نہ ہونے پر اُلٹے پھر آتے ہیں دوسری جانب حاکمانِ زنگ کی وظیفہ خواہی کے لیے خود کو ہلکان رکھتے ہیں اور میلوں اور مہینوں برسوں کی مسافت طے کر کے دربارِ فرنگ میں درخواست گزار ہوتے ہیں۔ ایک جانب اہل علم کی صحبتیں ہیں اور دوسری جانب قمار بازی کا چسکہ۔ بادہ خواری کے ساتھ مسائل تصوف پر اپنی دسترس کا زعم بھی ہے۔ مصلحت

پسندی بھی ہے اور خود داری بھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں کوئی خصوصیت مصنوعی نہیں ہے۔اس نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو غالب ایک مکمل انسان ہیں۔خوبیوں اور خامیوں کا امتزاج، خوبی اور خامی کی تعریف کیا ہے اس پر بھی ایک علاحدہ بحث کی گنجائش ہے کہ یہ تمام اصطلاحیں (Terms) بہت Relative ہیں مگر جس طرح اقبال کو رحمۃ اللہ علیہ کہہ کر ایک ایسے مقام پر فائز کر دیا گیا کہ جہاں تنقید کی گنجائش باقی نہیں رہتی اسی طرح غالب کے گرد بھی ان کے بعض مدّاحوں نے ایک ہالہ بنا دیا ہے جسے توڑے جانے کی ضرورت ہے۔فرد اور فنکار ایک قالب میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دراصل تبدل زمانہ کا جیسا فکری اثر غالب نے قبول کیا ان کے کسی ہم عصر کے ہاں نظر نہیں آتا۔اس کشمکش کے رنگ ان کی تحریروں اور کلام میں جا بجا بکھرے ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس تہذیبی و فکری کھینچ تان نے ان کی زندگی اور شخصیت کو مجموعۂ اضداد بنا دیا۔جو ان کے کسی ہم عصر شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔اس کشمکش کے رنگ ان کی تحریروں میں جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں بات یہ ہے کہ ہم نے انہیں اسی صورت میں قبول کرنے کے بجائے اپنی پسند کے مطابق ان کی تصویریں بنائیں اور اپنے ہی فریم میں نئی نسل کو پیش کر دیا۔آصف فرخی نے اپنے مضمون ''غالب اور تہذیبوں کا تصادم'' میں مرحوم خلیق انجم کا ایک اقتباس نقل کیا ہے:

''غالب کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم فن کار ہیں لیکن اس پایے کے فن کار کا جو رویہ زندگی کی طرف ہونا چاہیے۔وہ اس سے محروم ہیں۔عام طور پر عظیم فنکار'' شوق ہر رنگ رقیب سروساماں''، مجسمہ تفسیر ہوتا ہے۔وہ فن کو خونِ جگر سے سینچتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اسے تمام مادی ضرورتوں اور آسائشوں سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔غالب کا المیہ یہ ہے کہ صرف ان کا آدرش عظیم فن کی تخلیق ہے اور لیکن دوسری طرف ذوق کا ساجی وقار بھی ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔''

(آصف فرخی تہذیبوں کا تصادم۔غالب نامہ۔جولائی 2010۔ص 145)

یہ مسئلہ صرف خلیق انجم صاحب کا ہی نہیں ہے ہمارے بہت سے بزرگ ناقدین کا رویہ بڑے تخلیق کاروں اور ادب کے حوالے سے یہی رہا ہے۔تبدیلیوں کو بحالت مجبوری قبول کیا گیا ہے۔مثلاً محترم قاضی جمال حسین نے اپنی کتاب ''دام آگہی'' کے مضمون ''غالب کی دلّی'' میں لکھا ہے۔

''مغلیہ تہذیب کے ڈوبتے سورج سے کے ساتھ ہی، مغربی نظام فکر کا آفتاب تازہ بھی افق پر نمودار ہو رہا تھا۔ایک ذہنی کشمکش تھی۔صدیوں پرانی جمی جمائی بساط کے الٹنے کا غم اور بیزاری کے باوجود نئی تہذیب کو قبول کرنے کی مجبوری۔جذبے اور عقل کی آویزش کے نقوش، اس عہد کے ادبی سرمائے میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔''

(پروفیسر قاضی جمال حسین۔غالب کی دلی۔دام آگہی۔ص 102)

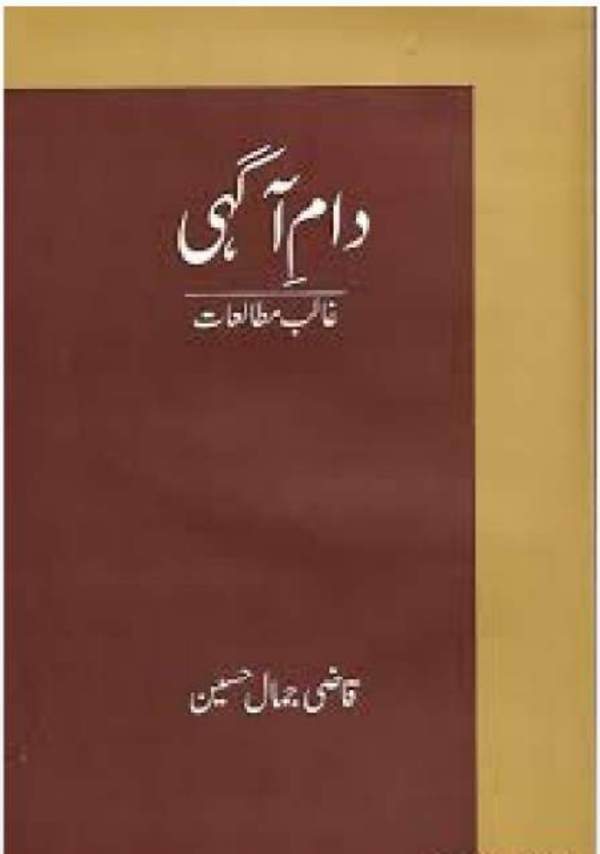


کیا واقعی نئی تہذیب کو قبول کرنا اس نسل کی مجبوری تھی یہ بات اس سے قبل کئی بار کی گئی کہ محمد حسین آزاد اور حالی امپیریل ایجنڈے کے تابع تھے۔گذشتہ صفحات میں جو بات کہی گئی ہے کہ ہر زمانے میں عوام کی چھوٹی تعداد تبدیلیوں کو مجبوراً نہیں بلکہ دل سے قبول کرتی ہے۔مثلاً حالی، غالب کے شاگرد تھے اور ان کی فکر سے متاثر۔انجمن پنجاب میں نوکری کرنا ان کی مجبوری ہوسکتی ہے مگر تراجم کے ذریعے مغربی ادب تک رسائی حاصل کرنا اور اس سے متاثر ہونا اور ان کی روشن خیالی کی دلیل ہے۔ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حالی سرسید وغیرہ کے برخلاف ایک

نسبتاً مڈل کلاس خاندان کے فرد تھے ان کو وظیفے اور آسائش میسر نہ تھیں پھر ان کی تمام زندگی ایک جدوجہد میں گزری۔ اسی لیے ماضی کی شان و شوکت کم از کم دنیاوی آسائشوں کے اعتبار سے ان کا مسئلہ نہیں تھی۔ اسی لیے وہ نئے نظام سے بہت جلد مانوس ہو گئے نظامِ نو کی جانب یہ رغبت محض انگریز کی نوکری کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ اس کا ایک قابل ذکر پہلو، غالب کی صحبتیں بھی تھیں جنھوں نے حالی کی فکری تربیت میں ایک بڑا کردار ادا کیا۔ سرسید کی آئین اکبری پر غالب کی تقریظ کا ذکر تو بار بار ہوا بلکہ اسے غالب کے سفر کلکتہ کا مرہونِ منت کہا گیا۔ کلکتہ میں غالب نے جن دخانی جہازوں، اور تار برقی کا ذکر کیا اور متاثر ہوئے، اس کے اظہار کو شمیم حنفی مرحوم نے ''محض وقتی ارتعاش'' قرار دیا اور انھیں پر کیا موقوف بہت سے ناقدین نے تہذیب کے دفاع میں غالب کی نئی تہذیب کی جانب جھکاؤ کی مختلف تاویلیں پیش کیں۔ اس سلسلے میں حامدی کاشمیری مرحوم کا مضمون غالب اور مغرب بھی اسی بات پر دلالت کرتا نظر آتا ہے جس میں انھوں نے قاضی عبدالجلیل جنوں کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے۔

> ''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیا کرتے ہیں۔ میں بھی اس محفل میں جاتا ہوں کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت چند روزہ ہے، اس کو دوام کہاں، کیا معلوم اب نہ ہو، اب کے ہو، آئندہ نہ ہو۔''

(حامدی کاشمیری۔ ''غالب اور مغرب، غالب نامہ۔ جولائی 2010۔ ص 127)

اس کو غالب نے پرانی تہذیب پر آہ وزاری سے تعبیر کیا ہے۔ 1857 کے پورے واقعے پر ان کی خاموشی کو بھی کاشمیری مرحوم نے حقیقت پسندی کہا اور

> ''بعض لوگ ہنگامۂ غدر میں ان کی خاموشی یا لاتعلقی کو انگریز دوستی یا ان کی ابن الوقتی پر تعبیر کرتے ہیں۔ یہ رویہ غالب ناشناسی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غدر کے دوران وہ خانہ نشینی اختیار کر چکے تھے مگر انہوں نے معصوم اور مظلوم ہموطنوں کی حالتِ زار سے چشم پوشی نہ کی ان کے کئی خطوط میں اس بے پناہ دکھ کا اظہار ملتا ہے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر قابض ہونے اور اس کے دستِ تظلم دراز کرنے کے نتیجے میں ان کے وجود میں سرایت کر گیا۔'' (ایضاً)

وہ انگریزوں کی حکمتِ عملی، سیاست گری اور سائنسی قوت سے آشنا تھے اور جانتے تھے کہ وہ ملک پر قابض ہو رہے ہیں اس لیے وہ ان کو شدید ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

حامدی کاشمیری کے اس خیال کی تردید غالب کی زندگی اور انگریزوں سے ان کی قربت کے سبب خود بخود ہو جاتی ہے۔ دراصل غالب کے تعلق سے اس قسم کے تضادات خود غالب کی ذات کی پیچیدگی کے سبب بھی پیدا ہوئے۔ حامدی کاشمیری نے اپنی بات کے ثبوت میں جن خطوط کے حوالے دیے ہیں ان سے کہیں بھی ان کی انگریز ناپسندیدگی کا سراغ نہیں ملتا۔ بات وہی ہے کہ ہم غالب کو اپنی پسند کے کردار میں ڈھالنے کی کوشش میں اس قسم کے تضادات کا شکار ہوتے ہیں۔ غالب ایک دنیادار شخص تھے۔

زنار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہم وار دیکھ کو

ہنگامۂ غدر میں غالب کی خاموشی کوئی جبر نہیں، مصلحت تھی بلکہ حکومت کی وفاداری اور تابعداری کے ثبوت کے طور پر انھوں نے خود بے گناہ ثابت کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ حالانکہ وہ ہنگامۂ غدر کے تماشائی بھی ہیں اس سے متاثر بھی ہیں:

ہے موجزن اک قلزم خون کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

مگر اس کا الزام انھوں نے بار بار ''باغیوں'' کو دیا۔ پہلے استاد شہ ہونے کی خواہش اور حاکمانِ فرنگ سے قربتوں کی طلب ان کے دل میں رہی۔ اہلِ اقتدار کی قربت کی خواہش ان کی دنیاداری کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

انگریزوں کی ابھرتی ہوئی قوت اور دلّی کے تخت پر فرنگی قبضہ غالب کے عہدِ پیری کا قصہ ہے اور عام نفسیات یہ ہے کہ عمر کے نشیب کی جانب سفر کرتی ہوئی نسل ماضی پرستی کا شکار ہوتی ہے اور جو ماضی کی مشعل ہاتھ میں لے کر ہی نشیب کا سفر کرنا چاہتی اور کرتی ہے۔ اس کے برخلاف نئی نسل اس روشنی کی طرف لپکتی ہے جو سامنے نظر آتی ہے۔ غالباً اسی کو عام لفظوں میں ''جنریشن گیپ'' کہا جاتا ہے مگر اسی بزرگ نسل میں ایک چھوٹا گروہ وہ بھی ہوتا ہے جو تبدیلی کو مجبوری میں نہیں بلکہ ذوق وشوق سے قبول کرتا ہے۔ غالب کے یہاں ایک دنیا آباد ہے، جو دشتِ امکاں کو ابھی ایک نقش پا سے دیکھتی ہے۔ اور تمنا کے اگلے قدم کے لیے زمین تلاش کرتی ہے غالب اس چھوٹے اور اقلیتی گروہ کا حصہ ہیں جو جنّت کی حقیقت جانتے ہیں اور تمام آسائشیں اور سہولیات جو وعدۂ فردا میں انہیں اسی دنیا میں حاصل کر لینا چاہتے ہیں غالباً اسی لیے غالب کے کلام میں جنت کے وعدے پر بے اعتباری کا اظہار بار بار ہوا۔

ہم جانتے ہیں جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا
واعظ نہ تم پیو ، نہ کسی کو پلاسکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاقِ نسیاں کا
مئےعشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی ہاتھ میں
کیا ہی رضواں سے جنت میں لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

جنت کی حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد دنیا میں ہی جنت کی سہولتوں کی تلاش نے انھیں دردر بھٹکایا اور اس تگ و دو میں حسد ورقابت نے بھی ایک کردار ادا کیا۔ بدنامیوں کا طوق بھی گلے میں پڑا۔ خاص طور پر ولیم فیریزر کے قتل کے کیس میں غالب نے جو منفی کردار کیا ہے اس کی تفصیلات بہت سے مصنفین کے یہاں مل جاتی ہیں۔

غالب کے ولیم فریزر سے دوستانہ تعلقات تھے یہ ایک الگ قصہ ہے مگر نواب شمس الدین سے ان کا تنازعہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ نواب شمس الدین کی سزائے موت میں غالب کی مخبری کا شک دلّی کے بہت لوگوں کو تھا خود غالب کو اس کا علم تھا مگر انھوں نے کبھی کھل کر اس شک کو رفع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر ولیم فریزر کے قتل کی تحقیقات میں حصہ لیا۔ جس کا اعتراف خود غالب نے بھی اپنے خطوط میں کیا۔

''قضارا جونشان بتلائے گئے اس بنیاد پر، جو غلط نہیں تھی
ایک سوار کو جو والئی فیروز پور کے ملازموں میں سے اس
ستودہ صفات شخص کے قتل جرم میں پکڑلیا......

(تنویر احمد علوی۔ اوراق معنی۔ص146)

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''یعنی مردمانِ شہر یہ واہمہ رکھتے ہیں کہ شمس الدین بے گناہ ہے فتح اللہ جنگ اور اسداللہ خاں نے انگریزوں کو اس کے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ مختصر یہ کہ قصہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مجھ پر لعنت ملامت دہلی کے یاوہ گویوں کا وظیفۂ لب بن گئی ہے۔'' (ایضاً۔ص147)

کیا عرض کروں کہ میری ہمت ایک عجیب کام کی انجام دہی میں مصروف تھی اور میری نظر بلند کی دیدہ بانی کررہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ہنگامہ ختم ہوا اور اس کے ہر کردار کو جیسا کہ چاہیے تھا اس سے عمل کی پاداش مل گئی......جاگیردار فیروز پور کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اس کی جاگیر اور متعلقات جاگیر بحق سرکار ضبط ہوئے۔(ایضاً۔ص50-149)

اس پورے کھیل میں غالب نے تماشائی اور تماشے کے ایک کردار کی حیثیت سے کام کیا۔ مگر باطن میں ایک خلش کا احساس بھی ان کے کلام اور خطوط دونوں میں نظر آتا ہے۔ جس میں ذاتی زندگی کی چند محرومیاں اور مفلسی (اگر انہیں محرومیاں کہیں) شہر دلّی کی تباہی اور گوروں اور کالوں میں اپنے احباب کے قتل کیے جانے کا افسوس بھی شامل ہے اور وہ ذلت و رسوائی بھی جو شاید ان کی اپنی بشری خامیوں کا شاخسانہ تھی۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
گلیوں میں مری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہ گزار تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

قصہ مختصر ایک عظیم فنکار ایک عظیم شخصیت بھی ہو یہ ضروری نہیں انسان کی شخصیت کی بہت سی پرتیں ہوتی ہیں ہر پرت دوسری پرت سے مختلف ہوسکتی ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ، ہر رنگ میں وا ہوجانا

□□□

Prof. Najma Rahmani
Room No. 86
Dept. of Urdu
Arts Faculty Building
North Campus
Delhi University-110007
Mob: 9953479211

# لالی چودھری کے سفرنامے

دیپک بدکی

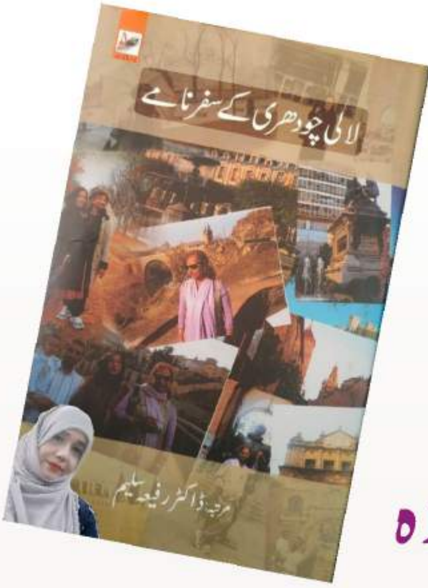


## ایک اجمالی جائزہ

میری نظر سے کئی سفرنامے گزرے ہیں جن میں سفرنامہ نگار نے مخصوص مقامات سے متعلق اپنے تاثرات وتجربات رقم کیے ہیں؛ کس طور تشریف آوری ہوئی، کن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، کن محفلوں میں شریک ہوئے اور کن مقامات کی سیر کی۔ لالی چودھری کے سفرنامے پڑھ کر پہلی بار محسوس ہوا کہ کوئی پیشہ ور جہاں گرد تاریخ کے پنّوں میں ڈُبکیاں لگا کر آنکھوں دیکھی بیان کر رہا ہے۔ سیمابی لالی نے 27 ملکوں اور امریکا کی 15 ریاستوں کا سفر کیا ہے اور ہر سفر کے بارے میں اپنے تاثرات منفرد انداز میں قلم بند کیے ہیں۔ زیرِ نظر سفرناموں میں ان کے دہلی، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور ہسپانیہ سے متعلق اسفار شامل ہیں۔ یہ سفرنامے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں اور 2016 میں ڈاکٹر رفیعہ سلیم کی محنت شاقہ کی بدولت کتابی صورت میں 'لالی چودھری کے سفرنامے' کے عنوان سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ 283 صفحات پر پھیلی ہوئی یہ ضخیم کتاب عرشیہ پبلی کیشنز،، دلشاد کالونی، دہلی-95 نے شائع کی ہے۔

لالی چودھری جہاں بھی جاتی ہیں اس مقام کی تاریخ کا مطالعہ کر کے جاتی ہیں تاکہ ان کے مشاہدے کا مزہ دوبالا ہو۔ ان کے سفرناموں میں ملخّص تاریخ بھی ملتی ہے اور خوش اسلوب منظر نگاری بھی۔ کہیں کہیں وہ متھ، اساطیر، تلمیحات اور بچپن کی یادداشتوں سے بھی اپنی تحریر کو مزیّن کرتی ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان کا لب ولہجہ افسانوی یا یوں کہیے داستانوی ہوتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر مقام کے بارے میں وہاں کے رسل و رسائل، کھان پان، لوگوں کے رویے اور میزبانی پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر رفیعہ سلیم سفرناموں کی ابتدا یوسف کمبل پوش کے 'عجائب فرنگ' سے 1837 میں ہوئی جبکہ نازلی رفیعہ بیگم پہلی خاتون تھیں جن کا سفرنامہ بہ عنوان 'سیر یورپ' 1908 میں شائع ہوا۔ لالی چودھری کے سفرناموں کے بارے میں فرماتی ہیں:

> ''رسالہ سب رس جون 2010 میں لالی چودھری کا سفرنامہ اندلس نظر آیا۔ یہ سفرنامہ قسط وار شائع ہوتا رہا۔۔۔ حیرانی کا گہرا احساس اس لیے ہوا کہ کیا غیر انسانوی ادب اور خاص طور پر سفرنامہ اتنا دلچسپ ہوسکتا ہے؟ ان کے دوسرے سفرنامہ پڑھنے کی شدید خواہش جاگی۔ میں نے استاد محترم پروفیسر بیگ احساس سے اس بات کا اظہار کیا انھوں نے مجھے بتایا کہ لالی چودھری مجتبی حسین صاحب سے بے حد عقیدت رکھتی ہیں۔ وہی دیگر سفرنامے منگوا سکتے ہیں۔ مجتبی حسین صاحب نئے اساتذہ اور لکھنے پڑھنے کا شوق رکھنے والوں کی حد درجہ حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ اور ممکنہ مدد کرتے ہیں۔ سارے مراحل بخوبی حل ہوگئے۔۔۔ لالی چودھری سے فون پر بات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ انتہائی مخلص، صاف گو، منکسر المزاج اور مجسم اخلاق شخصیت کی حامل ہیں۔ ان کی تحریر سے جو تصور قائم ہوتا ہے ہو بہو ویسی ہی ہیں۔۔۔ لالی چودھری نے اپنا پہلا سفرنامہ 2002 میں ''دلی

ایک شہر آرزو" لکھا۔ جسے عبدالرحمٰن صدیقی مدیر اردو لنک نے قسط وار شائع کیا۔ 2002 میں ہی پیرس کا سفرنامہ لکھا۔ مجتبیٰ حسین صاحب کے اصرار پر انھوں نے یہ سفرنامہ "خیاباں خیاباں ارم" کے عنوان سے لکھا۔ سورن صاحب کے اصرار پر جینوا کا سفرنامہ لکھا "سفرنامہ اندلس" خود اپنی رضا سے 2010 میں لکھا۔"

(لالی چودھری کے سفرنامے مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ سلیم، ص 24-23)

لالی چودھری اردو ادب میں بطور افسانہ نگار کافی شہرت پا چکی ہیں۔ 2002 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'حد چاہیے سزا میں' منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کا افسانہ 'گڈو' مقبولیت سے سرفراز ہوا۔ سفرناموں کی شروعات ماہنامہ 'سب رس' کے توسل سے 2010 میں 'سفرنامۂ اندلس' کے عنوان سے قسط وار شائع ہوئی۔"

لالی چودھری کا جنم لائل پور (فیصل آباد) پاکستان میں 14 اگست 1950 کو ہوا، اصلی نام نعیم اصغر تھا، 'لالی چودھری' محض نک نیم تھا جس کو انھوں نے بطور قلمی نام اختیار کیا۔ ایم اے (پولیٹیکل سائنس) کی تعلیم حاصل کر کے ادب، تاریخ اور سیاحت میں دلچسپی لیتی رہیں۔ شادی کے بعد ڈاونی، لاس اینجلز کو اپنا مستقر بنالیا۔

شہنشاہوں، ولیوں، عالموں، قطبوں اور قلندروں کی ملجا و ماویٰ دہلی، جس کی تاریخ مہابھارت سے بھی ہزاروں سال پرانی ہے، کے سفر کے بارے میں لالی چودھری 'دِلّی ایک شہر آرزو' میں رقم طراز ہیں کہ انھیں کیول سوری نے مدعو کیا تھا مگر سوری صاحب لالی چودھری کے دہلی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ تاہم ان کی مہمان نوازی کا بار کیول سوری کے دوست اندر جیت نے اٹھالیا جنھوں نے ان کو بہن بنا کر مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی یہاں تک کہ لالی چودھری کہہ اٹھیں کہ "ایسی محبتیں، ایسی وضعداریاں اس زمانے میں کہاں ملتی ہیں۔" باوجود یکہ فضا میں ماتم چھایا ہوا تھا لالی دو روز ہی میں دہلی کے علاوہ آگرہ و فتح پور سیکری کا گشت لگا کر آئیں اور ادبی محفلوں، ماس میڈیا اور ضیافتوں کی زینت بن گئیں۔ دہلی اور مغل سلطنت کی تاریخ سے وہ بخوبی واقف تھیں کیونکہ یہ ہماری سانجھی وراثت ہے۔ گو انھیں اپنی ماں کے آبائی وطن جالندھر کی گلیاں دیکھنے کا بڑا شوق تھا مگر وقت کی کمی کے سبب جا نہ پائیں۔ دہلی کی تاریخ کا خلاصہ کرتی ہوئی تحریر کرتی ہیں کہ "پرانی دلّی قلعے، محلوں، گنبدوں، میناروں، مزاروں اور مندروں کا وہ شہر ہے، جسے ہر فاتح نے پامال اور تاخت و تاراج کر کے اس کی راکھ پہ نئے دلّی شہر کی بنیاد رکھی۔ اشوک اعظم سے شاہ جہاں تک کیسے کیسے صاحب جلال و جمال شہنشاہ گزر گئے، اس شہر نے مسلمانوں کی عظمت و حشمت کا آغاز بھی دیکھا، عروج بھی دیکھا اور عبرت ناک زوال بھی۔" پرانی دہلی کے گلی کوچوں، چاندنی چوک، مرزا غالب کی حویلی، راج گھاٹ، خواجہ نظام الدین کی درگاہ، قطب مینار، آگرہ کے تاج محل، فتح پور سیکری، کرشن سے منسوب متھرا اور بندرابن کا بیان اس سفرنامے میں بڑی ہنرمندی سے کیا ہے، جو نہ صرف ان مقامات کی عظمت کی داستاں ہے بلکہ ان کی خستہ حالی کا بیانیہ بھی ہے۔

لالی چودھری نے تاج محل کے بارے میں جیکولن کینیڈی کے ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے جو تاج محل دیکھ کر جیکولین کے منہ سے نکلے تھے: "اگر کوئی اس کے لیے ایسا خوبصورت monument (یادگار) بنادے تو وہ فی الفور اسی وقت مرنے کو تیار ہے۔" دلّی اور تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے لالی چودھری نے مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال کی تاریخ بھی مختصراً بیان کی ہے۔ وہ جہاں شہنشاہ اکبر کی فراخ دلی کا ذکر کرتی ہیں کہ اس نے جودھا بھائی کو اپنے عقیدے پر چلنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی، وہیں شہنشاہ اورنگ زیب کی انسانیت سوز بہیمیت اور وحشیانہ پن کا ذکر کرنا بھی نہیں بھولی ہیں کہ کیسے اس نے اپنے باپ کو قید کیا اور اپنے بھائیوں کو قتل کر کے ان کے بریدہ سر بوڑھے باپ کو بطور تحفہ بھیج دیے۔

فرانس نہ صرف ملک گیری اور نپولین کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے بلکہ یہاں کی کلاسیکی عمارتیں اور میوزیم فرانسیسی تہذیب و تمدن کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ یہ ملک آرٹ، موسیقی، لٹریچر اور فلسفے کا گہوارا رہ چکا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان بولنا پسند نہیں کرتے۔ فرانس سے متعلق لالی چودھری کے پانچ سفرنامے ہیں: پہلا سفرنامہ 'خیاباں خیاباں ارم' پیرس کے بارے میں ہے جو خطاطی، شراب (Wine)، بوس و کنار (French Kiss) اور شنیل نمبر 5 پرفیوم کے علاوہ انقلابِ فرانس کے لیے مشہور ہے۔ سفرنامہ نگار نے پیرس میں دریائے سین پر کشتی کی سیر، آئیفل ٹاور، لوف (Louvre) اور میوزے دورسے (Musee D'Orsay) عجائب گھر، گلستانِ طویلیری (Jardin des Tuileries) اور انصاف محل– جہاں پہلی بار 'حریت، مساوات اور اخوت' کا نعرہ بلند ہوا تھا، ماری انٹونیٹ نے رعایا کو روٹی کے بدلے کیک کھانے کی ہدایت دے کر اس کا حشر دیکھا تھا اور نواحی گنبدوں (Babbler) سے اذیت خوردہ قیدیوں کی دل دوز چیخیں ابھری تھیں کو پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ پیرس کے سفرنامے میں لالی نے فرانس اور نپولین کی تاریخ سے وابستہ تاریخی عمارتوں، سقفوں، ستونوں اور مجسموں کی لفظی تصویریں بھی

کھینچی ہیں ۔اس بارے میں وہ مارک ٹوین کے قول کو پیش کرتی ہیں :" فرانسیسیوں سے بڑھ کر سنگ دلانہ نفرت کسی اور قوم نے اپنے بھائی بندوں سے نہیں کی ۔فرانسیسی خانہ جنگیوں ، بربریت اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں اپنی مثال آپ ہیں ۔" یہاں کی شاہراہوں کو دیکھ کر وہ چاندنی چوک، دہلی کی زبوں حالی اور انحطاط پر دکھ کا اظہار کرتی ہیں اور اس فرانسیسی سیاح کے الفاظ یاد دلاتی ہیں جس نے کہا تھا کہ کاش پیرس میں چاندنی چوک جیسی شاہراہ ہوتی۔ تعجب کی بات ہے کہ ان کو آئیفل ٹاور پسند نہ آیا جس کو انھوں نے 'بدصورت اور اپنے خالق کی کور بینی کا مظہر' قرار دیا ہے۔

دوسرا پڑاؤ نوتر دام کلیسا(Notre-Dame Cathedral) ہے جس کا ذکر اگلے مضمون میں کیا گیا ہے ۔اس سفر کے دوران انھوں نے قصر خورد(Petit Palais)، جو انیسویں صدی کے آرٹ کے لیے مخصوص ہے؛ قصر عظیم(Grand Palais) ، جو عارضی نمائشوں کے لیے وقف ہے؛ روبوناپارٹ (Rue Bonaparte) اور پلاسے دے ووج (Place de Vosges) کی سیاحت کر لی اور نہ صرف ان کی منظر کشی کی ہے بلکہ ان کے ماضی کو بھی اختصار کے ساتھ کھنگالا ہے ۔ بقول لالی چودھری " امرائے فرانس کا پسندیدہ میدانِ مبارزت(Duelling ground) یہی (پلاسے دے ووج ) تھا، جب کئی نوجوان اس کھیل میں مارے گئے تو لوئی سیزدہم کے وزیرRichelieu نے اس کھیل پہ پابندی لگا دی ۔" ان کے بعد گوتھک طرز تعمیر کے شاہکار، نوتردام ( بمعنی ہماری خاتون ) کیتھڈرل کی باری آئی جو800 رسال پرانا صلیب کی شکل کا کلیسا ہے اور واٹکن(Vatican) کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے ۔کلیسا کی تاریخ اور ڈھانچے سے سفرنامہ نگار قارئین کو آگاہ کرتی ہیں ۔نپولین کی رسم تاجپوشی اسی کلیسا میں ہوئی تھی۔کلیسے سے وابستہ دو ناولوں ، 'نوتردام کا کبڑا' (Hunchback of Notre Dame)اور 'لا میزراب' (Le Misrables) کا بھی ذکر آیا ہے۔اسی کلیسا کے نواح میں ایک قصاب انسانوں کا گوشت بیچا کرتا تھا اور اس دکان کی کلیجی کی بہت مانگ رہتی تھی ۔پھر اگلیز سینٹ میڈ(Eglise Saint Medard) کی زیارت کی جس کے متعلق کمسن لڑکیوں کی عذاب کوشی کی کئی روایتیں قائم ہو چکی ہیں ۔اس پاکھنڈ کو دیکھ کر انھیں برصغیر کے متشابہ شعبدہ بازوں کی یاد آ گئی۔ آخرش باستیے(Bastille) کے ذکر کے ساتھ یہ سفرنامہ تمام ہوتا ہے۔

تیسرا سفرنامہ 'دوشیزہ' اورلینز جون آف آرک' کے عنوان سے شامل ہے جو ایک کمسن دہقانی بہادر فرانسیسی بیٹی کو، جس کو لوگوں نے 'اورلینز کی دوشیزہ' کا خطاب دیا تھا، خراج پیش کرتا ہے ۔اس نے صرف نو دنوں کے اندر اورلینز کو برطانوی پنجۂ غلامی سے آزاد کر لیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد فرانس کے غداروں نے اسے گرفتار کیا اور انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اسے کفر کے ارتکاب میں 19 رسال کی عمر میں زندہ جلایا گیا۔نسوانی دلیری اور شہادت کی دلدوز کہانی ....! پس مرگ اسے کفر کے الزام سے بری کیا گیا اور 'سینٹ' کے خطاب سے نوازا گیا۔اس کے ساتھ ہی سینٹ مشل (St Michel) ،شارع ماہی گیر بلی(Rue du chat oui Pache) اور چھوٹا پل(Pont Petit) کے دورے، بٹوے کے کھو جانے مگر روپے کے بغیر واپس مل جانے اور کئی اساطیری قصوں، جن میں ایک راجہ پانڈو کے مادہ حاملہ ہرنی کے شکار کرنے سے ملتا جلتا ہے، کا بیانیہ اس سفر کا حصہ بن جاتا ہے۔فرانس کے سفر کا چوتھا مرحلہ 'ورسائی محل'(Versailles) کی سیاحت تھی- آفاقی وراثت ،لوئی چہاردہم کا خواب محل ،2500 رگھوڑوں اور دو بگھیوں کا اصطبل ،خوشنما باغات ،عمارتیں ،تفریح گاہیں ،سنگی زینے ، دیو پیکر مجسمے ،شبستان ملکہ اور چودہ سو سالہ تاریخی تصویروں کے نقوش اس سفرنامے کی جھلکیاں ہیں ۔ مذکورہ محل کی تاریخ ،اس کی تعمیر ، انقلابیوں کے ہاتھوں تخریب کاری اور پھر لوئی شانزدہم کا کنبے سمیت بھاگ جانا اور سرحد کے قریب پکڑا جانا، یہ سبھی واردات مشاقی سے بیان کیے گئے ہیں ۔ان سب کی کلپنا کر کے لالی چودھری کو مادام رولانڈ کا فقرہ یاد آتا ہے:" آزادی ! تیرے نام پہ کیا کیا ظلم روا نہیں ہوئے ۔"

آخری مرحلے میں پیرس کے شہرت یافتہ لوف میوزیم (Musee du Louvre) کی گشت لگائی گئی اور اس کو 'لوف اور مونا لیزا' کے عنوان سے اس کی ہسٹری سمیت رقم کیا گیا۔ یہ میوزیم پہلے ایک شہنشاہ کا محل ہوا کرتا تھا جو بعد میں میوزیم میں تبدیل ہوا۔اس میوزیم کا سب سے اہم اثاثہ لیونارڈو ڈاونچی(Leonardo da Vinci) کی بنائی ہوئی ایک فتنہ پرداز مسکراہٹ والی دوشیزہ کی تصویر 'مونالیزا'(Mona Lisa) ہے۔اس کے علاوہ یہاں سیکڑوں مجسمے ،تصویریں اور فنکاری کے نمونے نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں ۔لالی چودھری نے چنندہ نوادرات ، اہم مجسموں ،اور تصویروں کا ذکر کیا ہے جیسے نپولین کے تاج کا ہیرا، ایتھنز معبد کی شکستہ دیوار کا ایک ٹکڑا جس پر سینٹور (Centaur) کی تصویر کنندہ ہے [نوادرات ]؛ وینس ڈی مائلو، میکل اینجلو(Michelangelo) کے دو مجسمے 'خوابیدہ غلام' اور 'باغی غلام'(Rebellious Slave)؛ 'بال کامرانی' (Winged Victory) [مجسمے ]؛ ونچی کی 'دوشیزہ' سنگ (Virgin of the Rocks)'، اینجلو کی 'مرگ دوشیزہ' (Death of the Virgin)،ریمبرانٹ کی باتھ شیبا(Bathsheba) ،رفائیل کی 'کینڈر

گارڈن ٹیچر'(La Belle Jardine)، جیریکو کی 'غرق ہوتے جہاز' (Raft of the medusa)اور دیگر مصوروں کی پینٹنگز جیسے جوان بھکاری، مے نوشی، خانہ بدوش لڑکی، نجومی اور بہشت وغیرہ[تصویریں]۔ یہاں مختلف مصوروں کی بنائی ہوئی تصلیب (Crucifixion) کی تصویریں بھی لٹک رہی ہیں جو ناظرین کو اشک بار کرتی ہیں۔ سیر بین نے 'مونالیزا' کی چوری کی کہانی بھی درج کی ہے۔ دریائے سین کے اس پار ایک اور میوزیم ہے 'اورزے میوزیم' (Musee d'Orsay) جس میں جدید اور مابعد جدید مصوروں کی علامتی، تجریدی اور دیگر رجحانات کی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں مثلاً انگرہ(La Source)، کبانے(Naissance de Venus)، می یے (خوشہ چیں عورتیں) مانے، یوجین ڈیلا کرو، گستاف، پسارو، مونے، ڈیگاس، وان گو(La Meridienne)، پکاسو، گوگاں(Arareas)، لاریو (The Dreamer)، روڈن (دوزخی دروازہ)، جین دیلول(Whistler's Mother)، وسلر (School of Plato) وغیرہ۔ سفرنامہ نگار 'نشاۃ زہرا' کے توسط سے امام خمینی پر، جس نے پیرس میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا، طنز کرتی ہیں کہ شاید اس عریانی سے بوکھلا کر انھوں نے ایران میں پسِ انقلاب طبقۂ نسواں کے لیے مکمل پردے کا حکم جاری کیا ہوگا۔ لالی چودھری نے میوزیم اور کئی مصوروں کے کارناموں پر مختصر روشنی بھی ڈالی ہے۔ دریں اثنا چودھری نے ماضی میں یہودیوں پر ہوئے مظالم کو بھی اجاگر کیا ہے جس کے باعث 'کنسنٹریشن کیمپ' اور 'ہولوکاسٹ' ان کی یادداشتوں کا ناقابل تنسیخ جزو بن چکے ہیں۔

لالی چودھری نے سوئٹزرلینڈ کے اہم شہر جینوا کی سیاحت کر کے سفرنامہ بعنوان 'جینوا شہر امن یا شہر جیب تراشاں' رقم کیا ہے۔ بقول چودھری سوئٹزرلینڈ اپنی خوبصورتی، گھڑی سازی، غیر جانبداری اور ہینز کھاتا(Blind Account) بنک پالیسی کی وجہ سے اقتصادی طور پر خوشحال ہے۔ مجھے ہینز کھاتا(Blind Account) کی ترکیب کہیں اور نظر نہیں آئی، ہوسکتا ہے یہ ترکیب سوئٹزرلینڈ کے سیکریٹ بنک کھاتوں کے لیے استعمال کی گئی ہو۔ برن یہاں کی راجدھانی ہے جبکہ جینوا یہاں کا ایک شہرت یافتہ شہر ہے جو ہمیشہ سیاحوں اور بزنس کرنے والوں سے بھرا رہتا ہے۔ سولہویں صدی میں یہ شہر مارٹن لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر پروٹسٹنٹ مسلک کا روم بن گیا۔ سفرنامہ نویس نے جینوا کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور 'شوربے کے میلے' کا بھی ذکر کیا ہے۔ بقول لالی ''ویسے یہ ملک مجموعہ تضاد ہے، کچھ معاملوں میں بہت قدامت پسند ہے اور کچھ میں بہت لبرل۔'' 1970 تک عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں ملا تھا مگر نشے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی اور نشہ خوروں کو ہیروئن اور کوکین بطور دوائی فراہم کیے جاتے ہیں تا کہ وہ چوری اور طوائفیت جیسے جرائم کے مرتکب نہ ہوں۔ چودھری جنیوا کے مختلف مقامات کا مفصل ذکر کرتی ہیں جیسے کہسار ژورا کے دامن میں جھیل 'لے مان' اور اس جھیل کے اندر بنا ہوا خوفناک قلعہ؛ فوارہ Jet d'eou؛ دیوداتی بنگلہ (Diodati)، جہاں نامور شاعر لارڈ بائرن رہائش پذیر تھا، تھوڑی دوری پر ممتاز شاعر شیلے اپنی گرل فرینڈ میری کے ساتھ رہتا تھا اور تینوں جناتی کہانیاں لکھتے تھے، میری نے یہیں پر 'فرینکن اسٹائن'(Frankenstein) نام کا شہرت یافتہ ناول قلم بند کیا تھا ؛اقوام متحدہ، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور ریڈ کراس کی عمارتیں اور ان کی آرگنائزیشن ؛بارتھولونی حویلی ؛جنیوا نژاد انقلابی و راندۂ درگاہ روسو (Author of The Social Contract)کے نام منسوب 'جزیرہ روسو'؛ فلورل کلاک؛ ژونگ فراؤ، مونک، اور اوگر پہاڑیوں کے درمیان واقع انٹر لیکن؛ ریڈیائی کرنوں کی تحقیقاتی لیبارٹری ؛جھیل برین اور جھیل تھون؛ نباتاتی گلشن؛ ولسن محل اور Baths of Paquis وغیرہ۔ یہاں پر لالی کی جیب کاٹی گئی اور کیش، ٹراولرز چیک و پاسپورٹ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انھوں نے جلدی سے بنکوں سے رابطہ کر کے انھیں اطلاع دی۔ لالی نے سنا تھا کہ یہاں پر پاسپورٹ دیر سویر واپس ملتا ہے۔ بہت روز انتظار کے بعد آخر کار مل ہی گیا۔ اگلا مقام سوئٹزرلینڈ کا دارالخلافہ برن تھا جس کے متعلق بقول لالی چودھری کہاوت مشہور ہے کہ ''وینس (اٹلی) آب پر تعمیر ہوا ہے اور برن مے پر۔''

ہسپانیہ (اسپین) کے مختلف مقامات کی لالی چودھری نے خوب شہر نوردی کی ہے اور ان کے بارے میں کتاب میں چھ مضامین شامل ہیں: (1) کاخ وکوئے طلیطلہ(Toledo) (2) قصر سلیمان الیس کوریئل محل (3) مینار اور القصر اشبیلا (4) حرم قرطبہ (5) شام غرناطہ (6) طلسم الحمرا۔ اس سے پہلے کہ ان اسفار پر کچھ روشنی ڈالوں، یہ جاننا ضروری ہے کہ اسپین اسلامی آبادکاری اور تہذیب وتمدن کے اوج کمال کا ثبوت ہے۔ فن تعمیر، فلسفہ، الجبرا، علم نجوم، علم طب وغیرہ میں مسلمانوں نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ یونان اور روم کی کتابوں کے ترجمے بڑے انہاک سے کیے گئے، مفتوح قوموں سے جو کچھ سیکھ سکتے تھے، سیکھ لیا اور ان کو جو کچھ سکھا سکتے تھے سکھا لیا۔ مسلمانوں نے مشرقی علوم وفن کو مغرب میں متعارف کرایا اور اسے مقبول عام بنا دیا۔ ہسپانیہ کے کئی شہر مسلم اور عیسائی تہذیبی ترکیب کے مرکز بن گئے اور وہاں کی ملاوں تہذیب نے انسانی ترقی کی نئی راہیں کھول دیں۔ حالانکہ آخر کار نصرانی فوجوں نے سارے علاقے کو اپنے قبضے میں لے

لیااور اسلامی حکمرانوں کو سارا علاقہ خالی کرنا پڑا تاہم آج بھی اسلامی تہذیب کے جیتے جاگتے آثار سارے اسپین میں بکھرے پڑے ہیں جن کو دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں سیلانی ان مقامات کی سیر کرتے ہیں۔لالی چودھری نے میڈرڈ کو فوکل پوائنٹ بنایا جہاں اس کی بھانجی فریحہ اور اس کا شوہر ظفر اپنے دو بچوں کے ساتھ اقامت پذیر تھے۔وہاں سے سفر کی ابتدا ہوئی اور پہلا نشانہ مقدس تولیدو (طلیطلہ )ٹھہرا جو بیت المقدس کے بعد ابراہیمی مذاہب کے لیے دوسرا اہم مقام ہے۔اس قدیم شہر کو بارہ یہودی قبیلوں نے بسایا تھا جو یروشلم کے زوال کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ شروع میں طلیطلم نام تھا۔پہلے رومی اور پھر وزگاتھوں کے قبضے میں آ گیا اور اس کے بعد مسلمانوں نے اس پر قبضہ جما لیا۔لالی چودھری نے اس شہر کی تاریخ کا مختصر خاکہ کھینچا ہے۔تولیدو اندلس کا سب سے خوشحال دارالخلافہ تھا جس کو جزیرہ نما آئی بیریا(Iberian Peninsula) میں مرکزی پوزیشن حاصل تھی۔سوا تین سو سال کے بعد اس کو الفونسو ششم کی حکمرانی میں نصرانی فوجوں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔تولیدو کی فتح عیسائیوں کے لیے دوسرے علاقوں کو زیر کرنے کے لیے بہت اہم تھی۔1560 میں فلپ دوم نے دارالخلافہ کو تولیدو سے میڈرڈ منتقل کر دیا جس سے اس شہر کی اہمیت کم ہوگئی۔عربی بول چال اور طرز بودوباش نے یہاں بہت اثر کیا اور یہاں کے باشندوں کو 'مثل عرب'(Mozarab) کہا جانے لگا۔فلپس دوم نے مسلمانوں اور یہودیوں کو عیسائی بننے ورنہ شہر خالی کرنے کا حکم صادر کیا۔

ایک روایت کے مطابق اسپین کی خانہ جنگیوں میں کرنل موسکارڈو (Moscardo) نے اپنے یرغمال شدہ بیٹے کی پروانہ کرکے دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا۔مصوری کی مناسبت سے یہ کیتھڈرل پرادو کوچک(Little Parado) ہے جہاں ایل گریکو کی پینٹنگ 'عیسیٰ کو بے لباس کرتے ہوئے' (Disrobing of Christ)؛ گویا کی 'عیسیٰ سے دغا' (Betrayal of Christ)، اور دیگو ویلاث قث (Diego Velazquez) کی ایک شاہکار پینٹنگ برائے نمائش رکھی گئی ہے۔اس کے علاوہ یہاں حضرت عیسیٰ کے تختۂ سولی کا ٹکڑا اور انمول ہیروں و جواہرات سے لدا 'معبد مریم' کا مجسمہ ہے جو آسکر وائیلڈ کے قول کی یاد تازہ کرتا ہے کہ ''کلیسا زرو جواہر اور بے بہا دولت سے مالا مال ہیں اور لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔'' یہاں سے لالی 'کرائسٹ کی مسجد'(Del Cristo) کی زیارت کرتی ہیں جو اب چرچ میں تبدیل ہو چکی ہے۔میڈرڈ جانے سے پہلے وہ میگل دی سروانتیس(Miguel de Cervantes) کا مجسمہ دیکھنے جاتی ہیں اور روایت کے طور پر اس کو رگڑتی ہے تاکہ وہ بھی قلم کار بن سکے۔سروانتیس کے ناول ڈان قی ہوٹے (Don Quixote) کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ انجیل مقدس کے بعد سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔دوسری صبح لالی چودھری کا ٹارگیٹ شقوبیہ میں واقع قصر سلیمان تھا جس کا تذکرہ انھوں نے ''قصر سلیمان ایس کوریَل (Escorial) محل'' میں کیا ہے۔میڈرڈ سے تیس کلومیٹر کی دوری پر وادیِ الرما(Guardarrama) میں San Lorenzo de la Escorial شہر واقع ہے۔ایک زمانے میں یہ شاہی محل شان و شوکت کے لیے مشہور تھا مگر اب بدرنگ، بے کیف اور نیم جنگل ڈھنڈار سنگی عمارت لگ رہی ہے۔اپنے ارتقائی سفر میں یہ کلیسا، میوزیم، درسگاہ، لائبریری اور شاہی قبرستان سے ہوتا ہوا نشاۃ ثانیہ کی سب سے بڑی عمارت اور آفاقی ورثہ مانا جاتا ہے۔یہاں حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کے عظیم الشان مجسمے نصب کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ سان لورینز(San Lorenzo) کا مجسمہ بھی ہے جس نے عیسائیت کو گلے لگایا تھا اور اسی کی پاداش میں اسے زندہ جلایا گیا تھا۔اس قصے کو سن کر سیاح کو امام حسین، میرابائی، منصور حلاج، اور سرمد کی یاد آتی ہے۔سیلینیا(Cellinia) کا تراشیدہ حضرت عیسیٰ کا بُت بھی یہاں نصب ہے۔تصویروں میں وے لاث قث کی بنائی ہوئی 'یوسف کا کرتہ' (Joseph's bloody coat)؛ ، تسیانو کی 'آخری طعام شام' (The Last Supper) بھی یہاں ٹنگی ہوئی ہیں۔اس کے بعد لالی شاہی قبرستان پر حاضری دیتی ہیں جہاں چارلس پنجم سے لے کر سبھی شہنشاہ دفن ہیں۔کیتھڈرل کے احاطے میں ایک وسیع و عریض لائبریری بھی ہے جس میں انمول کتابیں اور مسودے رکھے گئے ہیں۔اس میں سلطان ابو معالی کے مجموعے بھی محفوظ ہیں۔واپسی پر لالی میڈرڈ نوردی کرتی ہیں۔ اس شہر کی بنیاد نویں صدی میں عربوں نے رکھی، دریا کے قریب ہونے پر محمد اول کی ایما پر اس کا عربی نام مریط (سرچشمۂ آب ) رکھا گیا جو بعد میں مجریط اور پھر میڈرڈ ہو گیا۔یہاں کی مسجد کو الفانسو نے کلیسا میں بدل کر کنواری مریم کی نسبت سے المودینہٗ ورجن رکھ دیا۔لالی چودھری میڈرڈ دوسری بار آئی تھیں، اس لیے بہت ساری جگہیں پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔ یہاں پر انھوں نے پرادو میوزیم کے علاوہ پلازہ مئیر، جس چوک پر بُل فائیٹنگ اور باغیوں اور مخالفین کے سر قلم کیے جاتے تھے؛ شاہی محل، جو ورسائی اور شون برون کے بعد یوروپ کا تیسرا بڑا عالیشان محل ہے، جو ابھی تک بیرون ممالک کے سربراہوں کو دیے جانے والے عشائیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور جس کی چھت پر اپولو اور اس کا رتھ اور بزم رندان میں باکس(Bacchus) جو مے نوشی کے لیے مشہور تھا، کی تصویریں بنی ہوئی

ہیں، کا نظارہ بھی کرلیا۔ بقول چودھری ''سقفِ ایوان مسند شاہی کی تصویر کشی ہسپانیۃ الکبریٰ کے اس دور کو خراج پیش کرتا ہے جب ان کی سلطنت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا (سلطنت ہسپانیہ یوروپ کی سب سے بڑی سلطنت تھی، رومۃ الکبریٰ سے بھی بڑی)۔'' شاہی محل سے نکل کر لالی پرادو میوزیم پہنچ گئی جہاں گویا، ولاث قث، ایل گریکو، رفاعیل، وغیرہ کے کینواس سجے ہوئے تھے جن میں گویا کی 'زحل اپنے بیٹے کو کھاتے ہوئے' اور 'بھیانک خواب' فکر و تردد میں ڈال دیتے ہیں۔ دراصل اس میوزیم کے پاس تصویروں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ میوزیم میں صرف ایک چوتھائی تصویریں ہی لگائی گئی ہیں جبکہ باقی سب بند پڑی ہیں۔ لالی کو موڈرن آرٹ خاص کر پکاسو کی تصویروں سے کوئی رغبت نہیں ہے اور نہ ہی پیرس کے آئیفل ٹاور سے۔

'مینار اور القصر اشبیلہ' اگلا پڑاو تھا۔ میزبان نے پہلے ہی مرا کی چوروں اور خانہ بدوشوں (Gypsies) سے خبردار کیا تھا۔ آٹوچا کے ریلوے سٹیشن (Estacion de Atochia) میں دہشت گردی کے سبب 2004 میں 191/ افراد ہلاک اور ۱۸۰۰/ سے زائد زخمی ہوئے تھے۔ اسپین کی آوے (بمعنی طائر) ٹرین (Alta Velocidad Espanola) فرانس کی TGV سے تیز رفتار ہے جبکہ جاپان کی بہ نسبت دوسرے نمبر پر ہے اور 5 منٹ سے زیادہ لیٹ ہونے کی صورت میں ٹکٹ کا کرایہ واپس ملتا ہے۔ اشبیلہ کی عظمت کا اندازہ اس کی تاریخ سے لگایا جاسکتا ہے۔ قشتالہ میں دنیا کا سب سے بڑا گاتھک کیتھڈرل ہے جو الموحہ سلطان ابو یعقوب یوسف کی مسجد کو مسمار کر کے فرنانڈو چہارم نے بنوایا تھا جہاں کرسٹوفر کولمبس کی قبر ہے۔ یہاں دنیا کا بلند ترین 20/ منزلہ خوبصورت جیرالڈ بُرج ہے جو اصل میں سلطان ابو یعقوب یوسف کی اور یجنل مسجد کا مینار تھا۔ مینار کے علاوہ مالٹوں کا صحن اور وضو کے لیے حوض بھی ہے۔ القصر (Al Cazar) مسلم، گاتھک اور نشاۃ ثانیہ تعمیر فن کی آمیزش سے بنا ہوا عبدالرحمان سوم کا قلعاتی محل ہے جس کے اندر دلنواز محلات، روشیں، باغیچے اور گلشن ہیں۔ علاوہ ازیں ماریادے پادیا (Maria de Padilla)، جو ظالم حکمران پیڈرو نے اپنی داشتہ کے لیے بنوایا تھا جس نے اس کو کالے جادو سے اپنے قابو میں کرلیا تھا؛ گڑیا گھر، جو پہلے سراپا زنان خانہ تھا؛ القصر کا گلشن اور وادیِ الکبیر کے کنارے بارہ اطرافی قلعہ تورے دل اورو (Torre del Oro)، جہاں سونے کی ٹائیلیں بچھی ہوئی تھیں اور سورج کی روشنی میں جگمگاتی تھیں، قابل دید ہیں۔ قرطبہ کی زیارت کا بیان 'حرم قرطبہ' کے تحت کیا گیا ہے۔ مشرق میں استنبول وبغداد کے ہم پلہ اور مغرب میں لاثانی، قرطبہ دور امیّہ میں اندلس کا عروس البلاد تھا جو رات بھر منوّر رہتا تھا اور جہاں 500/ مسجدیں، 300/ حمام اور 70/ لائبریریاں تھیں۔ حکمران عالم و فاضل تھے اور لائبریریوں میں الجبرا، طب، سائنس، قانون، فقہ، ادبیات اور فلسفے کی کتابیں محفوظ تھیں۔ اس کا پرانا نام 'قراطوبۂ (Krat Juba) تھا جو ۸۰۰/ قبل مسیح میں بسایا گیا تھا اور اس پر رومیوں، بازنطینیوں، وزگاتھوں اور عربوں کا قبضہ رہا۔ مسلمانوں کے قبضے میں یہ شہر 1236 تک 525 سال رہا۔ مسجد قرطبہ خانۂ کعبہ اور مسجد نبوی کے بعد مسلمانوں کی مقدس ترین مسجد مانی جاتی ہے۔ یہاں اب نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے مگر علامہ اقبال نے یہاں پروفیسر آرنلڈ کی مدد سے نماز پڑھی تھی اور وجد میں آکر نظم 'مسجد قرطبہ' قلم بند کی تھی۔ لالی چودھری نے بھی کوشش کر کے دو رکعت نماز پڑھ ہی ڈالی۔ '600'X450 طول و عرض، ساتھ میں خوبصورت صحن، مالٹوں کے پیڑ (بہت پہلے کھجور کے پیڑ بھی ہوا کرتے تھے)، اور سبز پتوں کے احرام اس مسجد کے وقار کا ثبوت ہیں۔ برج درا سے جڑا قصہ یوں ہے کہ گورنر المنصور نے سان ڈیگو (سینٹ جیمز) کے مقدس قلعے کی گھنٹیاں اتروا کر عیسائی قیدیوں پر لاد کر قرطبہ لائی تھیں اور بطور انتقام 1236 میں فرنانڈو سوم نے اس کا الٹ کر کے یہاں کی گھنٹیاں مسلمان قیدیوں پر لاد کر سان ڈیگو پہنچوا دیں۔ ایک کشمیری شعر کا اطلاق اس قصے پر ہوتا ہے کہ ایک حکمران ایک عبادت گاہ کا پیروکار بن گیا اور دوسرا حکمران دوسری عبادت گاہ کا پیروکار بن گیا مگر ان دو کے درمیان بے چاری غریب عوام پستی چلی گئی۔ مسجد قرطبہ کے بعد مدینۃ الزہرا اور ابن رشد (Averroes) کے مجسمے کی باری آئی۔ مدینۃ الزہرا اپنے وقت کا ورسائی محل تھا جو عبدالرحمان سوم نے بنوایا تھا۔ ابن رشد ارسطو کے فلسفے کا شیدائی تھا اور اس نے ارسطو کے رسالوں کی شرحیں لکھی تھیں۔ اس کے خیالات اپنے زمانے کے مروجہ فلسفے اور ذہنی افکار سے مختلف تھے۔ بقول چودھری ''وہ مذہب و آخرت، عقل، روح اور دیگر مسائل پہ تمام علما سے اختلاف رکھتا تھا ...وہ پہلا عربی فلاسفر تھا جس نے آزادیِ فکر کا چراغ جلایا۔'' آخری عمر میں اسے عیسائیوں کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ شہر غرناطہ کی سیر بنی 'شام غرناطہ' میں بیان کی گئی ہے۔ غرناطہ (بمعنی انار) دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ عظیم الشان تاریخی، ثقافتی اور آفاقی حیثیت (ورثہ) کے مالک اس شہر کی آب و ہوا معتدل ہے۔ یہاں کے شاہی معبد میں کرسٹوفر کولمبس اور ملکہ ازابیلا کے مجسمے اور فرنینڈ و کو غرناطہ اور الحمرا کی چابیاں پیش کرتے ہوئے سلطان ابو عبداللہ کی تصویر اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے نزدیک بنایا گیا کلیسا El Sagrario جامع مسجد کی راکھ پر

کھڑا ہے ۔ Zacatin ایکسچینج ، عدالت اور حمام کے لیے مشہور تھا، جبکہ باب الرمبلا چوک میں نہ صرف دکانیں لگتی تھیں بلکہ نیزہ بازی اور دیگر کھیلوں کا انعقاد بھی ہوتا تھا ۔ Coral del Carbon دوہری تہری محرابوں سے آراستہ خوبصورت دومنزلہ مورش سرائے ہے ۔ اس کے علاوہ لالی چودھری نے البائی سین کا ذکر بھی کیا ہے جو ایک اہم شہر تھا، جہاں کی اہم سڑک کاریرا دل دارو (Carera del Darro)؛ حویلی سے بنا ہوا میوزیم؛ سالوڈور (De la Salvador) کلیسا، جو البائی سین کی جامع مسجد کو مسمار کر کے بنایا گیا اور سان نکولس وئیو پوائنٹ (Miradore San Nicolas)، جو یوروپ کا رومانٹک ترین مقام ہے، قابل نظارہ جگہیں ہیں۔ القصبہ میں سلطان ابوعبداللہ کی ماں کا محل 'دارالحمرا' ہے۔ جس کا بیان سفرنامہ نگار نے الگ باب 'طلسم الحمرا' میں کیا ہے ۔ یہاں پر دوسرے مقامات کی طرح عیسائیوں نے یہودیوں پر بڑے ظلم ڈھائے اور وہ بھاگ کر پرتگال چلے گئے مگر وہاں پر بھی ان پر بہت ساری مصیبتیں نازل ہوئیں، انھیں غلام بنایا گیا اور جو سمندر کے راستے بھاگنے کی کوشش کرنے لگے، انھیں غرق آب کیا گیا۔ القصبہ میں لائبریریوں کی بے شمار کتابیں نصرانیوں نے نذر آتش کیں۔ بقول مورخ پول (Pool) ''جس روز غرناطہ نے ہتھیار ڈالے اس روز جہالت نے علم پر فتح پائی تھی۔''

لالی چودھری کے سفرناموں میں غضب کی منظر نگاری ملتی ہے جو دل کو چھو جاتی ہے۔ کچھ نمونے پیش کرتا ہوں:

☆''یہاں بھی سب کچھ اپنے لاہور جیسا تھا۔ ویسے ہی دھول سے اٹے درخت، ویسی ہی کثیف دھواں چھوڑتی ہوئی بسیں، ویسی ہی پٹرول ملی گرد کی بو، ویسا ہی جانا پہچانا اجنبی موسم، ویسے ہی اجنبی راستے۔'' ('دِلّی ایک شہر آرزو' ص 34)

☆''عبادت گاہ کسی بھی مذہب کی ہو اس پر پُراسرار تقدس ہوتا ہے۔ نوتر دام کے اندر بھی ایک الوہی فضا تھی۔ رنگ برنگ کانچ کے ٹکڑوں سے مزیّن دریچوں اور سقفی روشن دانوں سے آتی ہوئی ملکوتی روشنی میں محراب در محراب اور قطار در قطار دروازوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے قدموں کی چاپ کسی دوسرے عالم سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

(نوتر دام کلیسا، ص85)

لالی چودھری کی تحریروں کی سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ وہ ضعیف الاعتقاد ہیں نہ متعصب۔

جہاں تک لالی چودھری کے فن کا تعلق ہے ان کے سفرنامے ان کی جمالیاتی حس کا مظہر ہیں۔ وہ نہ صرف مقامات کی تاریخ مختصراً بیان کرتی ہیں بلکہ اشیا، نوادرات اور فنون لطیفہ کا بھی تفصیل سے جائزہ لیتی ہیں جو انھیں کا خاصّہ ہے۔ مقامات سے جڑی روایات، اساطیری کہانیوں اور توہمات کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ انگلی پکڑ کر کسی بچے کو سیر گلشن کرا رہی ہے۔ لالی اپنی تحریروں میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال بڑی ہنرمندی سے کرتی ہیں البتہ غیر اردو خاص کر فرانسیسی الفاظ کا یو کے انگریزی کے تلفظ کے حساب سے استعمال کر لیتیں تو بہتر رہتا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلیم لالی چودھری کے فن کے بارے میں لکھتی ہیں:

''لالی چودھری کے یہ سفرنامے دوسرے سفرناموں سے مختلف ہیں۔ تاریخ سے ان کی بے پناہ دلچسپی تاریخی عمارتوں کے بارے میں ان کے تاثرات اور جو دردمندی ہے وہ ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔ کئی مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ لالی چودھری کے اندر ایک حساس عورت کا دل دھڑکتا ہے۔ لالی چودھری کی زبان سب سے منفرد ہے، جہاں جو لفظ سجتا ہو وہ لفظ چاہے کسی بھی زبان کا ہو، اسے بے ساختہ استعمال کرتی ہیں۔ انگریزی جس تیزی سے بولتی ہیں اتنی ہی برجستگی سے اسے برتتی بھی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رواں دواں اردو کے دریا میں انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بنے ہوں۔ ان کی تراکیب میں جدت اور ندرت ہے جسے وہ اس خوبی سے استعمال کرتی ہیں کہ تحریر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔''

(لالی چودھری کے سفرنامے مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ سلیم، ص23)

مجھے امید کامل ہے کہ لالی چودھری آگے بھی اپنے سفرناموں سے ہمیں فیض یاب کرتی رہیں گی کہ اردو ادب کو ان کی سخت ضرورت ہے۔ اردو میں شاعروں کے دواوین اور فکشن نگاروں کے مجموعے تو آئے دن منصۂ شہود پر ظاہر ہوتے ہیں مگر ایسے سفرنامے بہت کم لکھے جاتے ہیں۔

□□□

**Deepak Budki**
A-102, S G Imression, Sector 4-B,
Vasundhra
Ghaziabad-201012 (U.P)
Mob:09868271199

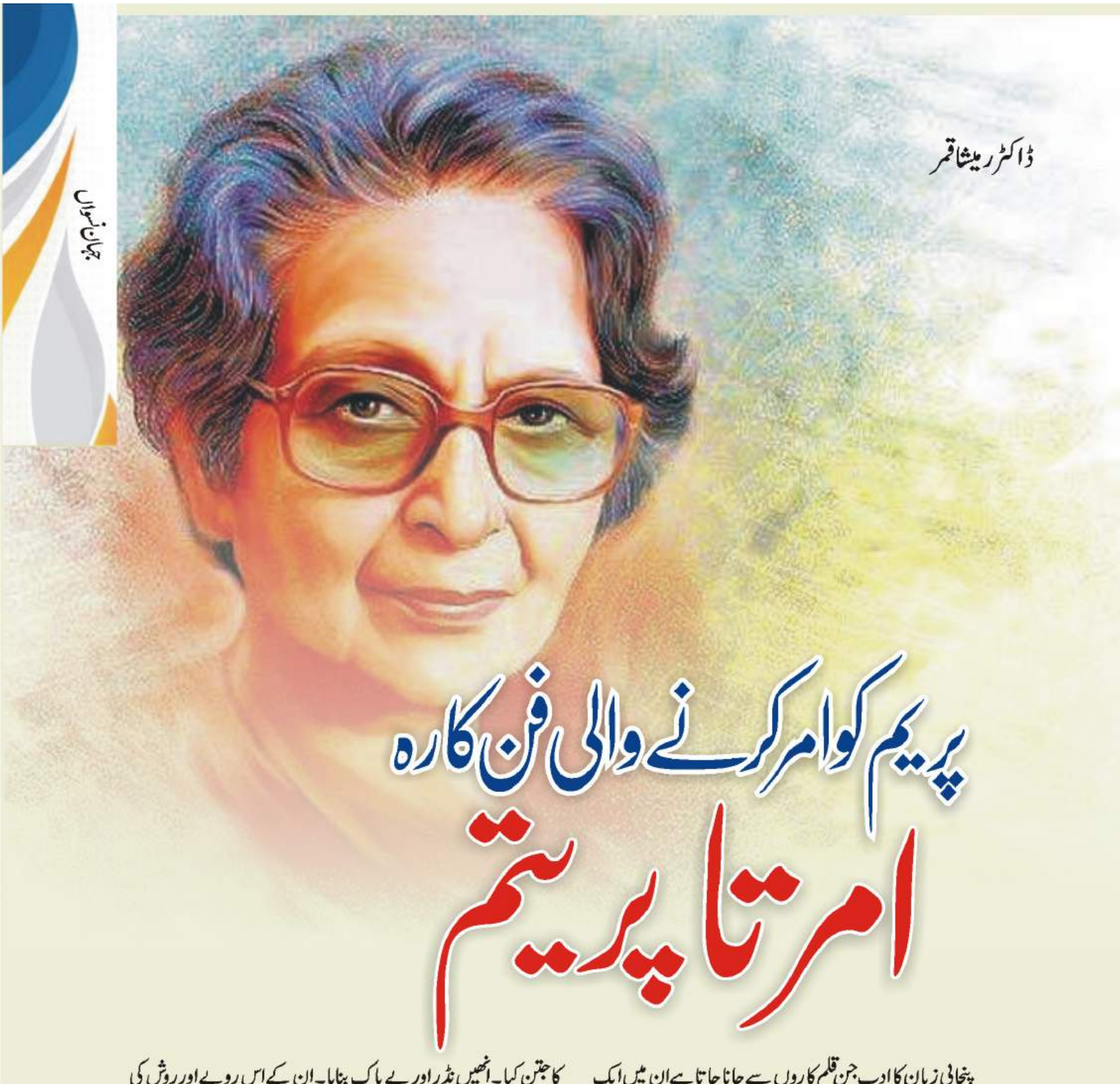

# پریم کو امر کرنے والی فن کارہ
# امرتا پریتم

ڈاکٹر ریشا قمر

پنجابی زبان کا ادب جن قلم کاروں سے جانا جاتا ہے ان میں ایک نام امرتا پریتم کا بھی ہے۔ انھوں نے سو سے بھی زائد ادب کی کتابیں لکھی ہیں جن میں شاعری، کہانی، ناول، خودنوشت اور تنقید سبھی کچھ شامل ہے۔ ان کی تحریریں خصوصاً شعری تخلیقات قاری کے اوپر سحر طاری کر دیتی ہیں۔ انھوں نے مظلوم عورت کو اپنے قلم سے انصاف دلانے کی کوشش کی اور جب تک زندہ رہیں محبت و پیار کا پیغام دیتی رہیں۔ امرتا پریتم نے اپنی تحریروں سے خواتین کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انھوں نے عورتوں کے سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا اور ہندوستانی عورت کو خوف کے شکنجے سے نکال کر کھلے ماحول میں لے جانے کا جتن کیا۔ انھیں نڈر اور بے باک بنایا۔ ان کے اس رویے اور روش کی کھل کر مخالفت بھی کی گئی۔ ان کی اس سوچ سے اس زمانے کے بعض ادیبوں اور دانشوروں نے انحراف بھی کیا مگر وہ ڈری نہیں۔ بے باکانہ انداز سے آگے بڑھتی رہیں اور ایسی تمام مزاحم قوتوں سے مردانہ وار مقابلہ کرتی رہیں۔ ان کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے سماجی حالات و واقعات اور عورتوں کے معاملات و مسائل کی ترجمانی اور عکاسی میں کسی خاص اخلاقی معیار کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ انھوں نے جس طرح محسوس کیا ان کو اسی طرح بنا کسی لاگ لپیٹ کے ہو بہو پیش کر دیا۔

ان کا دائرہ فکر و عمل زیادہ وسیع ہے۔ وہ اپنے عہد کی واحد ایسی بے

باک، نڈر اور بے خوف قلم کارہ ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کے واقعات کو بغیر کسی جھجک اور اخلاقی دباؤ کے پیش کر دیا۔ بلاشبہ وہ عورت کی سچی زندگی کی عکاس و آئینہ دار ہیں۔

امرتا پریتم نے عورت کی سماجی زندگی کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس مرد اساس معاشرے میں خواتین کی زندگی کا کھوکھلا پن اور مردوں کا منافقانہ رویہ پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ انھوں نے سماجی زندگی خصوصاً عورت کی حالت زار کو بہتر بنانے اور اس کی اصلاح کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کے لیے انھوں نے گوناگوں سماجی موضوعات پر بحث کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ کئی جلتے ہوئے سوال بھی اٹھائے اور مروجہ تصورات و نظریات کی خوب مذمت بھی کی۔ نیز انھوں نے معاشرتی خرابیوں کو دور کیا اور ان کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا۔ جیسے بچپن کی شادی اور بے جوڑ شادیوں کے خلاف انھوں نے نہ صرف یہ کہ کھل کر لکھا، ان کی مذمت کی بلکہ ان خرابیوں کی اصلاح اور لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی بیداری کے لیے ٹھوس عملی اقدامات بھی کیے۔

امرتا پریتم صرف پنجابی، اردو یا ہندی کی ہی شاعرہ اور ادیبہ نہیں تھیں بلکہ مختلف زبانوں میں تراجم کے سبب وہ دوسری زبانوں کے ادیبوں اور قارئین کے درمیان بھی کافی مقبول و مشہور تھیں۔ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا اور صاحب ذوق شخص ہوگا جو امرتا پریتم کے نام و مقام اور وارث شاہ کو مخاطب کر کے کہے گئے ان کے اشعار سے واقف نہ ہو۔ 1947 تقسیم ہند کے واقعے پر سینکڑوں شعراء و اُدَبا نے اپنی اپنی تخلیقات میں اپنے رنج اور دکھ کا اظہار کیا مگر امرتا پریتم کا انداز اور لب و لہجہ سب سے منفرد و جداگانہ تھا۔ ان کی درد بھری آواز ہر دل میں اتر گئی اور وہ پریم کی دہائی دیتی ہوئی ہمیشہ کے لیے امر ہو گئیں۔ انھیں ان کی جس تخلیق سے ساری دنیا میں شہرت ملی ان کی وہ نظم ''آج آکھاں وارث شاہ نوں" ہے۔ یہ شہرہ ٔ آفاق نظم ان کے مجموعہ "نویں رت" میں شامل ہے۔ جہاں وہ وارث شاہ کو مخاطب کرتی ہیں۔ وہی وارث شاہ جو اپنے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ تھے اور جنھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا اور جو شہرت یافتہ تصنیف "ہیر" کے خالق ہیں۔ وارث شاہ کو پنجابی زبان کا شکسپئیر بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری نے پنجاب کے لوگوں کا دل موہ لیا۔ سید وارث شاہ کی شاعری امن اور محبت کا درس دینے کے ساتھ ساتھ روحانی تسکین کا باعث بھی ہے۔

ان کی شہرہ آفاق نظم "آج اکھاں وارث شاہ نوں" جس میں انھوں نے تقسیم ہند کے دوران ہونے والے ظلم و ستم کا نوحہ لکھا ہے۔ یہ نظم ان کے شعری مجموعے "ہجر کی نظمیں" کے عنوان سے پنجابی سے ہندی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور جس کا ہندی سے اردو میں ترجمہ ماہر منصور نے کیا ہے۔ یہ ایسی پر تاثر نظم ہے کہ اسے دنیا کی پر تاثیر شاعری کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ نظم جوان کی تعریف کا واحد ذریعہ بن گئی۔

آج آکھاں وارث شاہ نوں
کتھے قبراں وچوں بول

یہ نظم ہندوستان کی تقسیم کے وقت جو خون کی ہولی کھیلی گئی جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی ہر ذات ہر نسل ہر مذہب کے لوگ مارے گئے کچھ شہید ہو گئے کچھ نے خود کو ختم کر لیا۔ امرتا پریتم نے ان بے ثبات دنوں میں بے کسی اور بیچارگی میں گندھی ہوئی نظم کہی۔

پنجاب کی سرزمین جو لہلہاتے کھیتوں اور عشق و محبت کی کہانیوں سے سرشار زمین ہوا کرتی تھی جہاں پر کی جانے والی محبتوں کو وارث شاہ نے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ امرتا پریتم پنجاب کی یادوں میں پس کر بیائی (nostalgic) کیفیت میں جا کر اس دور کو یاد کرتے ہوئے حال میں پنجاب میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں ناانصافیوں اور کج رویوں کا رونا روتے ہوئے وارث شاہ کو بلا وادے رہی ہیں:

وارث شاہ!
آج تم سے کہتی ہوں
اپنی قبر سے بولو
اور عشق کی کتاب کا کوئی نیا ورق کھولو
پنجاب کی ایک بیٹی روئی تھی تو
تم نے اس کی لمبی داستان لکھی
آج لاکھوں بیٹیاں رو رہی ہیں وارث شاہ!
یہ تم سے کہہ رہی ہوں
ہاں۔۔۔۔تم سے کہہ رہی ہوں

(ہجر کی نظمیں (پنجابی نظمیں ہندی سے) اردو ترجمہ، ماہر منصور، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 2017ص28)

اے وارث شاہ تم نے ایک داستان تو لکھ دی تھی ہیر کی داستان جو امر ہوئی۔ مگر "ہیر" کے بعد بھی ایسی کئی داستانیں ہیں جو ادھوری ہیں۔ ان داستانوں کو کون اپنے لفظوں کے جادو سے زندہ جاوید کرے گا۔ کون ہمارے غم کو ہمارے دکھ کو سمجھے گا کون ہمارے غم کا نوحہ لکھے گا۔ اب تو ہمارے پنچایت کے چوپال سرد پڑے ہیں۔ ہمارے کھیتوں کی آبیاری کرنے والے پانچوں دریا جنھوں نے ہمیں پیار و محبت اور انسان دوستی کا

درس دیا تھا۔ یہ وہی پنجاب ہے جو پانچ دریاؤں "جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس کے گزرنے سے بنا ہے۔ یعنی "پنج آب" والی سرزمین۔ ان ہی دریاؤں نے مختلف احساسات و جذبات کی کہانی ہمیں سنائی ہے جس کے کنارے لڑکیاں (پانی بھرتیں) یا گھڑے بھرتیں اور ان کے عشاق بانسریاں بجاتے۔ ان کی بانسری کی مدھر لے پر یہ محبت میں ڈوبی رقص کرتی تھیں مگر اب یہاں پر ایک عفریت نے بسیرا کر دیا ہے کہ ان دریاؤں کا پانی انسانی لہو سے سرخ ہو گیا ہے۔ زرخیز زمینیں اب زہر اگل رہی ہیں۔ یہاں کی خوش کن پروا اور پون اب زہریلی ہو گئی ہے۔

ہر بانس کی بانسری
جیسے اک ناگ بنا دی گئی
ان ناگوں نے
لوگوں کے ہونٹ ڈس لیے۔

(ہجر کی نظمیں (پنجابی نظمیں ہندی سے) اردو ترجمہ، ماہر منصور، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 2017 ص28)

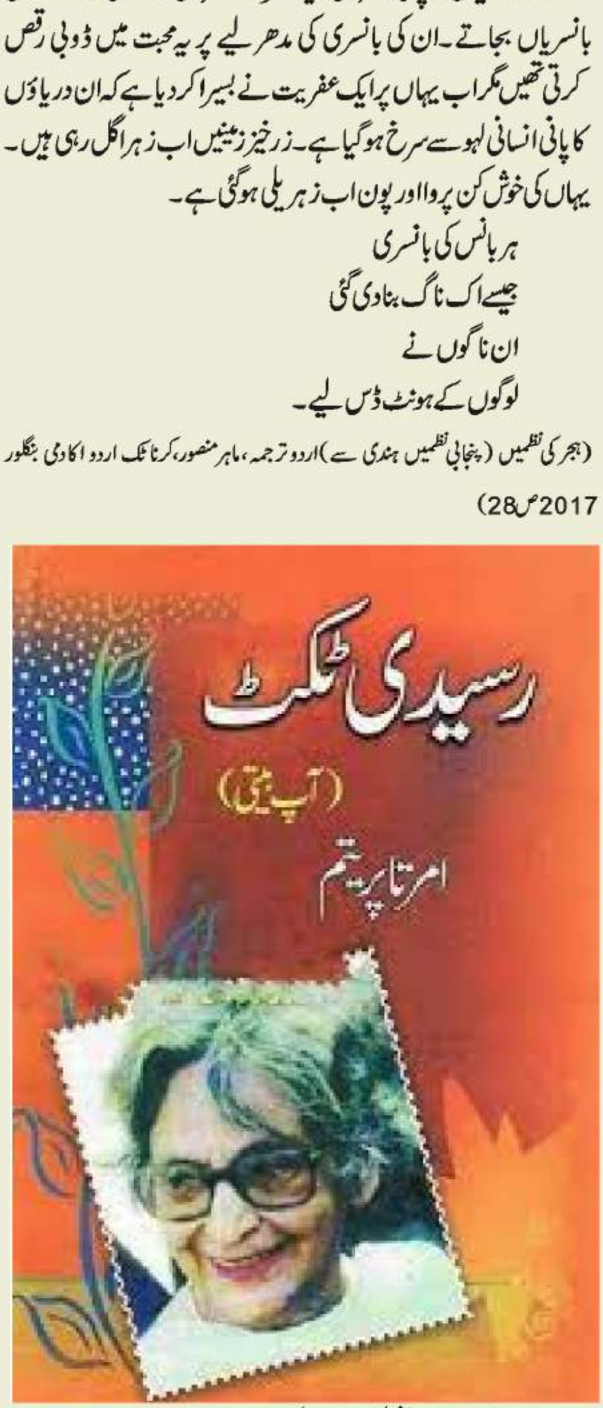


پہلے یہاں رانجھے کی بانسری کی مدھر لے پر الھڑ دوشیزاؤں کے دل دھڑکتے تھے اور پانی بھرنے والی بالیکاؤں کے کان بانسری کی آواز سے محظوظ ہوتے تھے۔ ندیوں کے کنارے یہ لڑکیاں پانی بھرتے ہوئے اٹھلاتی ہوئی بل کھاتی ہوئی چلتی تھیں بالکل ناگ کی طرح۔ ناگ بھی اسی طرح بل کھاتے ہوئے چلتا ہے اور اب ان کی سریلی اور مدھر آوازیں ناگ کی آوازوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اس نے پنجاب کے معاشی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی ظلم و ستم کو ناگ بن کر جا بجا اس انداز میں ڈسا ہے کہ سارا جسم نیلا پڑ گیا اور یہاں کے سریلے گیت گانے والے لوگ "سرمد گلو" (سرمہ کھلاتے ہیں تو گلا پھٹ جاتا ہے اور گیت گانے والا گانا بند کر دیتا ہے) ہو جاتے ہیں۔

خوف اور دہشت کا ماحول ایسا ہے کہ کسی میں بولنے کی سکت نہیں گویا خوف نے قوت گویائی کو ہی سلب کر لیا ہے۔ ہر گلے سے گیت ٹوٹ گیا ہے اور چرخے سے دھاگا ٹوٹ گیا ہے۔ وہی چرخہ جس پر دھاگے کو کاتا جاتا ہے دھاگے کے تانے بانے بنے جاتے ہیں۔ تانے بننا گویا زندگی کی علامت ہے۔ تہذیب کی علامت ہے "چرخے کا دھاگہ ٹوٹ گیا"۔ لباس ایک تہذیب کی علامت ہے۔ اشرف المخلوقات میں انسان کپڑے بنتا ہے کیونکہ وہ مہذب ہے اگر یہ دھاگا ٹوٹ جاتا ہے تو یہاں مطلب تہذیب مٹتی جا رہی ہے۔

کتنا خوبصورت سماں ہوتا تھا جب محفلیں روشن تھیں۔ پنجاب کی وہ سرزمین جہاں لڑکیاں سکھیوں، سہیلیوں اور ٹولیوں کی شکل میں وقت گزارتی تھیں اب وہ سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئی ہیں یعنی سماج میں دوستی اور رفاقت کا ایک نظام تھا وہ ٹوٹتا جا رہا ہے محفلیں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ محفلیں ویران، زندگی مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ وہی پنجاب ہے جس میں پانچ دریا اپنی روانی سے بہتے رہتے تھے جو پوری سرزمین کو سیراب کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کا نام ہی پنجاب اور دوآبے ہے۔ جہاں دلکش اور خوبصورت آرائش و زیبائش کے ساتھ کشتیوں کو سجایا جاتا تھا مگر اب ملاحوں نے کشتیاں جلا دی ہیں وہی کشتیاں جو پنجاب میں رابطے کی علامت تھیں۔ مگر اب وہ رابطے ٹوٹ رہے ہیں۔ بچھڑ رہے ہیں۔ موت سے پہلے ہی ہم سب مر رہے ہیں۔ ندیاں، پنگھٹ اور بانسری کی مدھر آواز، چرخہ اور ملاحوں کی کشتیاں کہیں دور، بہت دور کسی کہانی کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔

پیپل کے درخت پنجاب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پنجاب کا سب سے اہم درخت پیپل کا درخت ہے۔ جس کی وہاں بہتات ہے اور اس کا ذکر وہاں کی لوک کہانیوں میں بھی ہوتا ہے۔ اب وہاں ایسی صورتحال ہے کہ انسان تو انسان پیڑوں نے بھی اپنی ٹہنیاں توڑ دی ہیں۔ وہ رانجھا جو ہیر کے لیے بانسری بجاتا تھا اور اس کے ساتھ اس کے دوست

احباب اور بھائی بھی اپنی اپنی محبوبہ کے لیے بانسری بجاتے تھے۔ وہ سب کہیں کھو گئے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ کہاں کھو گئے اور بانسری بجانا کیوں بھول گئے ہیں؟

بارش کا برسنا ہم نے دیکھا جب یہ آسمان سے برستی تھی تو زمین کو زرخیز و شاداب بناتی تھی۔ مگر اب دھرتی پر ہر طرف لہو برس رہا ہے اور قبروں سے خون ٹپکنے لگا ہے۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں لاشوں کے ڈھیر دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور کسی پل قرار ممکن نہیں ہے۔

محبت انسانی زندگی کا وہ واحد جذبہ ہے جس سے ہر رشتے کی ڈور بندھی ہوئی ہے جو آدم اور حوا سے چلتا آ رہا ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ محبت یا عشق آفاقی جذبہ ہے محبت ہی وہ احساس ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ کر رکھتا ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں اور خواتین میں یہ جذبہ شدید ہوتا۔ وہ سچی محبت اور وفا کی متلاشی ہوتی ہیں اپنے محبوب کی راہ تکتی ہیں مگر وہ نہیں جانتیں کہ ان کو " کیدو" جیسے حسن و عشق کے کرداروں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

ایسے پر آشوب ماحول میں جہاں انسانیت اور محبت دم توڑ رہی ہے یہ سب دیکھتے ہوئے امرتا کا روم روم سلگ رہا ہے انسانیت کا درد پورے جسم میں دوڑ رہا ہے ان کی روح تک بے چین ہو اٹھی ہے اور اسی بے چین روح کے ساتھ وہ وارث شاہ کو آواز دیتی ہیں کہ۔

اے وارث شاہ میں اب ایک اور وارث شاہ کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں۔ اپنی قبر سے اٹھو اور کتاب عشق کی ورق گردانی کرو۔ امرتا پریتم ایک سیکولر روح تھیں جو عورت سے زیادہ انسان تھیں اور بس اپنے چاروں اور انسان دیکھنا چاہتی تھیں۔۔ وہ گیت لکھتی تھیں عشق اور موت کے۔ عشق کو سچ مانتی اور سچ مان کر عشق کرتی تھی۔ امرتا کے نزدیک اس عشق کے کئی مدارج تھے جیسے انسان کے ساتھ عشق، اپنے دیش سے عشق، دھرتی سے عشق، دریا سے عشق، وطن کی مٹی سے عشق، کھیت کھلیانوں سے عشق، اور اپنے گھر سے عشق وغیرہ۔ اس سلسلے میں اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''عشق امرتا پریتم کا ذاتی مسئلہ تھا اس نے اسے کبھی ڈھنڈورا بنا کے نہیں پیٹا۔ مگر اس کی شاعری کا تمام تر حوالہ انسانیت اور اجتماعیت ہے وہ انسان کو ایک فرد کی حیثیت میں بھی اسی حرمت و تکریم کا سزاوار مانتی ہے اور مجموعی طور پر انسانی سماج کو بھی قدروں کے اعلیٰ ترین مقام پر سرفراز دیکھنا چاہتی ہیں انسان اس کا دین ہے عشق اس کا مسلک ہے''۔

(سہ ماہی ادبیات اسلام آباد اکتوبر 2009 تا مارچ 2010، ص 39)

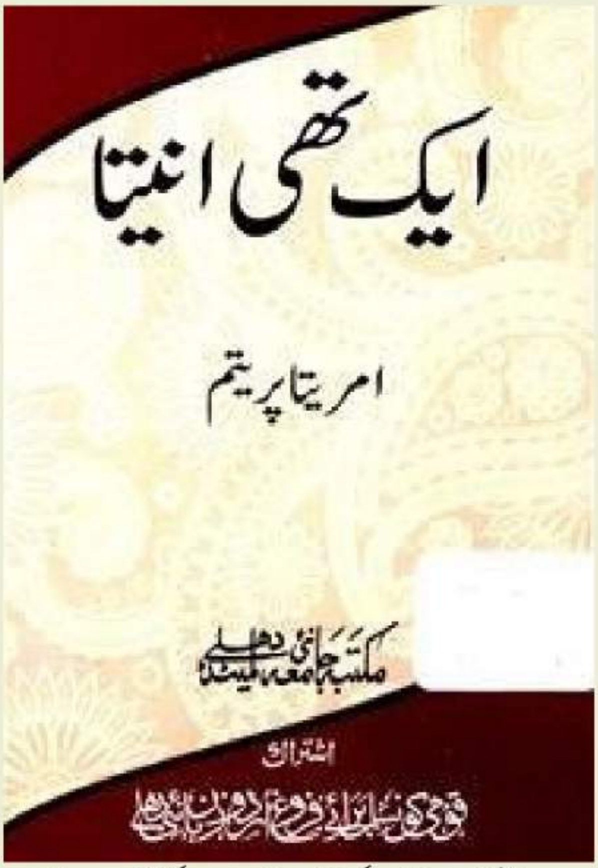


عشق ہی ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا وہ زندگی کی کڑواہٹ کو محبت کے دو بول سے چن لینے کا فن جانتی تھیں۔ محبت نامے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''امرتا پریتم ایک عامیانہ قسم کی مسرت پرست نظر آتی ہیں مگر محبت ناموں کا بین السطور میں مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جسم سے ماورا اور روبہ اختیار ہے۔ وہ ہمیشہ سرگرم سفر رہتی ہیں۔ آگے آگے ستاروں سے بھی آگے۔ بعض لوگوں کے نزدیک محبت اپنا سفر خاک و خوں کی تیرگی سے شروع کرتی ہے اور روح کی سرحدیں بلندیوں پر پہنچ کر اسے اپنی منزل نظر آنے لگتی ہے جہاں وہ کبھی نہیں پہنچ پاتیں۔ دیگروں کی رائے میں سفر کا یہ سلسلہ بالکل برعکس ہوتا ہے پہلا نظریہ کلاسیکی ہے اور دوسرا جدید تمدن کی پیداوار۔ میرا اندازہ ہے کہ امرتا نے خاک و خون اور رنگ و بو کے مراحل طے کر لیے ہیں اب وہ اس تجریدی کیفیت کی جانب رواں ہے جہاں محبت موضوع سے بے نیاز ہو کر خود کو اپنا مامن وہ مسکن بنا لیتی ہے۔ لیکن جس طرح جب کوئی سیارہ اپنا مدار بدلتا ہے تو

اپنے گزشتہ مدار کے خصائص سے فی الفور دستبردار نہیں ہو پاتا امرتا کے تصور کے نہاں خانے اب بھی کہیں کہیں خاک وخوں اور رنگ وبو کی تابانیوں سے آباد دکھائی دیتے ہیں۔"

(محبت نامے: امرتا پریتم۔ روہتاس بکس لاہور 1992 ص 9-8)

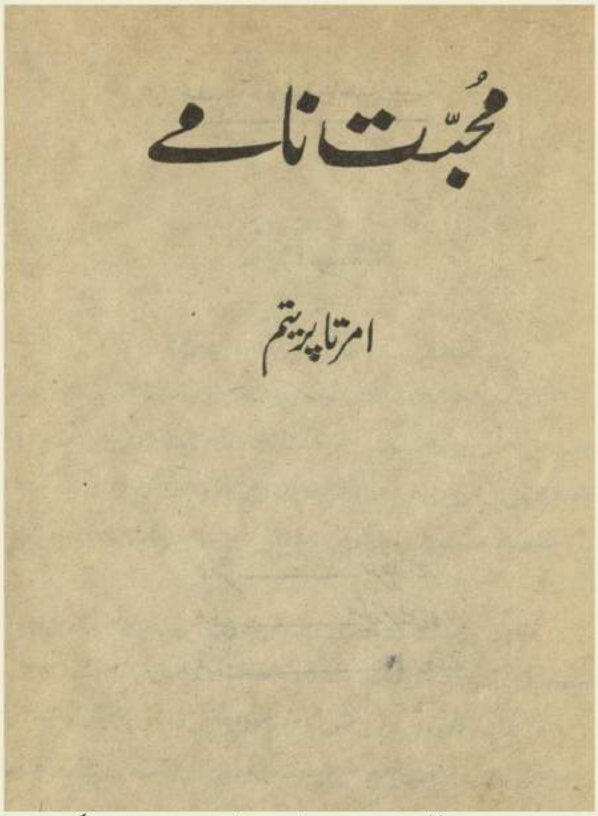


امرتا پوری نظم میں وارث شاہ کو محبت کی دہائیاں دیتی ہیں کہتی ہیں عشق ومحبت اور پیار واپنائیت سے زندگی کو دلکش اور حسین بنانے کے لیے۔۔۔وارث شاہ اٹھو۔۔۔۔اور ان دوشیزاؤں کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی نیا باب کھولو۔ ان کی اسی فطرت شناسی کو سمجھتے ہوئے گلزار نے کہا ہوگا کہ:

''امرتا جی کی نظموں میں بھی زمانہ نظر آتا ہے۔ان کا دور دکھائی دیتا ہے۔ بات کرتے وقت ایک کائنات کھول کے رکھ دیتی ہیں لیکن جب کائنات کو سمیٹ کر نجی بات پر آتی ہیں تو کچھ دوستوں کے چہرے نظر آنے لگتے ہیں اور وہاں وہ گاڑھے گہرے دنیاوی رشتے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں جہاں سماج کے گھاٹ پر کرنے کے لئے بہت سے فل جلا دینے پڑتے ہیں۔۔"

(سہ ماہی ادبیات اسلام آباد اکتوبر 2009 تا مارچ 2010، ص 78)

امرتا پریتم کی پنجابی نظم " آج آکھاں وارث شاہ نوں" زبان زد خاص وعام بن گئی۔ گویا یہ نظم اہل پنجاب کے دلوں کی آواز بن گئی ایک عورت کی چیخ و پکار ایک للکار اور بین۔ اس نظم میں پنجاب کی دہائی ہے جہاں وہ وارث شاہ کو آواز دے رہی ہیں۔ فریاد کر رہی ہیں۔ امرتا کا قلم پنجاب کے واسیوں کے دل کی صدا بن کر دبستان شعر میں ابھرا اور برصغیر کے ادبی منظر نامے پر چھا گئیں۔ شاید رفعت ناہید نے اسی لیے کہا کہ:

''امرتا پریتم عشق کے رس میں گوندھ کر بنائی گئی ایک حسین عورت جو سراپا گداز تھی۔ سرتاپا چاہت، جس کا رواں رواں محبت کے گیت گاتا ہوا، ٹوٹتی، ٹوٹ کر بنتی، بکھرتی بکھر کر سمٹتی۔ وہ by birth شاعرہ تھی. اس نے بہت لکھا, بے تحاشا لکھا اور آخری دم تک لکھا۔ اس میں ہر احساس کو لکھنے کی طاقت تھی۔ خود اس پر بیتی پڑھنے والے پر بیت جاتی ہے۔ ایک شفاف عورت جس نے اپنی زندگی کی کتاب کھول کر رکھ دی کہ جیسے:

دیکھو وہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں میں نے تو
سب حسابِ جاں برسرِ عام رکھ دیا"

(سہ ماہی ادبیات اسلام آباد اکتوبر 2009 تا مارچ 2010، ص 100)

مذکورہ بالا تجزیے کی روشنی میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ امرتا پریتم ایک ایسی تخلیق کار تھیں جن کے سینے میں ایک ایسا دردمند اور حساس دل تھا جو ذرا سی آنچ پر پگھل جاتا تھا۔ ان کا مشاہدہ یا تجربہ ایسے پر اثر لفظوں میں بیان ہوتا تھا کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ آج بھی ان کے فن میں یہ اثر موجود ہے۔ انھوں نے کئی لاجواب تحریریں ادب کو دی ہیں ایک قلم کار کی حیثیت سے انھوں نے یہ فریضہ بخوبی نبھایا امرتا کی بغاوت اور بے باکی اپنی جگہ لیکن اس نظم کے ذریعے انھوں نے انمول تحفہ دیا ہے امرتا نے شاعری میں نئے زاویوں کی داغ بیل ڈالی اور آئندہ آنے والوں کے لیے نئی راہیں روشن کیں۔

□□□

**Dr.Ramisha Qamer**
Flat No:189 Near Mahindra Showroom
Sedam Road
Kalaburagi-585105(K.S)
Mob No:7259673569

شاہد حبیب فلاحی

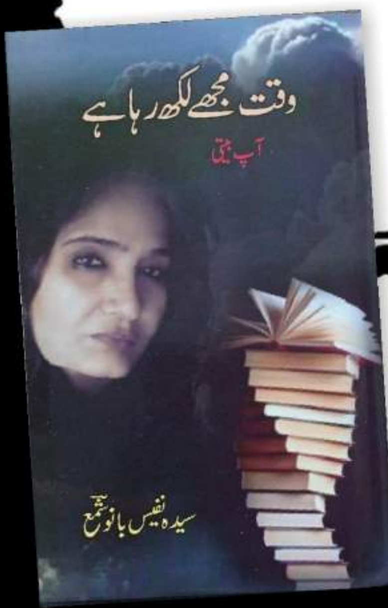


# نفیس بانو شمع کی خودنوشت

## وقت مجھے لکھ رہا ہے

سیدہ نفیس بانو ایک حساس فنکارہ کے طور پر اردو دنیا میں جانی جاتی ہیں۔ نثر میں ان کی تین کتابیں "سماج" (ناول) "جنت سے نکالی ہوئی حوا" (خودنوشت) اور "برف کا آدمی" (افسانوی مجموعہ) منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں اور شعری مجموعے "کائنات بھر سناٹا" (2000)، "کچھ درد کے صحراء سے" (2011) اور "مہکی مہکی رات" (2014) ان کی غزلوں، نظموں اور حمد ونعت و رباعیات میں ان کی ریاضتوں کے ثمرات ہیں۔ حقیر کا ان سے تعارف کا ذریعہ 2010 میں "شاعر" میں شائع ان کا افسانہ بنا تھا۔ افسانے کی قرات کے بعد فن کارہ سے رابطہ کرنے پر مجبور ہوا۔ گفتگو ہوئی تو ان کی طرف سے حقیر کو کچھ کتابیں موصول ہوئیں۔ ان کتابوں کے مطالعے کے بعد محسوس کر رہا تھا کہ مجھے جلد ہی نفیس کے فکر وفن پر تفصیلا لکھنا چاہیے لیکن یہ موقع ابھی تک مل نہیں پایا۔ اس کا حد درجہ افسوس ہے۔ ان کے فکر وفن پر ایم فل کرنا چاہ رہا تھا لیکن بوجوہ ایسا ممکن نہ ہوسکا۔

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" کے بعد سیدہ نفیس بانو شمع کی خودنوشت کا دوسرا حصہ "وقت مجھے لکھ رہا ہے" کے نام سے منظر عام پر آنے کی خبر سے ان کے مداحوں کے بیچ میں بے پناہ خوشی ہے۔ "جنت سے نکالی ہوئی حوا" ان کی ایک کامیاب اور بے باک خودنوشت ہے جو 1998 میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کے بعد 2016 میں اس خودنوشت کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا تھا، لیکن نفیس بانو کے پرستاروں کو ان کی خودنوشت کے دوسرے حصے کا شدید انتظار تھا اور بالآخر یہ خوش خبری آ ہی گئی کہ اب ان کی یہ خودنوشت پریس سے نکل کر ان کے مداحوں کی ضیافت طبع کے لیے حاضر ہے۔ نفیس بانو کی خودنوشت کے اس دوسرے حصے کا انتظار ان کے مداحوں کو اس لیے بھی تھا کہ انھوں نے اپنی پہلی خودنوشت کے آخری صفحے پر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ "مجھے زندگی کے اس سفر میں جو درد ملے، جو تجربات ہوئے یا جو مشاہدات کیے وہ صفحۂ قرطاس پر حرف حرف بکھیر دیا ہے۔ پھر بھی تشنگی باقی ہے۔ اگر مجھے یہ امید ہوتی کہ میرے بعد میری اس کتاب کو کوئی منظر عام پر لا سکتا ہے تو میں آخری وقت تک لکھتی رہتی۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کہانی کا ایک انجام ہوتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ میری کہانی ابھی جاری ہے اور وقت مجھے لکھ رہا ہے۔" (جنت سے نکالی ہوئی حوا، صفحہ: 250)۔ نفیس کی خودنوشت کی ان آخری سطروں کو پڑھ کر ان کے ہر قاری کی یہ خواہش شدید تر ہو گئی تھی کہ نفیس یوں ہی لکھتی رہیں تاکہ ان کے بے باک قلم کی سچائیوں سے سماج کے مزید سفید پوشوں کی قلعی کھلتی رہے اور ایک خاتون قلمکار کے بھی جذبات و احساسات کو سنجیدگی و وقار کے ساتھ ادب میں احترام و قبولیت کا درجہ دیا جانے لگے۔ لیکن کیا یہ ممکن بھی ہے کہ نفیس اسی طرح سے بے باکانہ انداز میں لکھتی رہیں اور ان کی خودنوشت کے اوراق منظر عام پر بھی آ جائیں! بظاہر یہ محال نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ ایک تو عمر رفتہ کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ کب وقت موعود آ جائے اور دوم یہ کہ اس طرح کے بے باک قلم کی تپش کو جو لوگ برداشت نہیں کر سکتے کیا وہ نفیس کو اس کی اشاعت کی چھوٹ بھی دیں گے؟ پتہ نہیں۔ اسی امید و بیم کی کیفیت میں دو سال گزر گئے اور جب ان کی شاعری کا اولین مجموعہ سن 2000 میں "کائنات بھر سناٹا" کے نام سے آبشار پبلیکیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع ہوا تو ناشر

نے نفیس کی خودنوشت کے دوسرے حصے "وقت مجھے لکھ رہا ہے" کی خوشخبری ان الفاظ میں دی:

"وقت مجھے لکھ رہا ہے" نفیس بانو شمع کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ، ایسے لرزہ خیز، چونکا دینے والی حقیقت پر مبنی جنسی واقعات، جنھیں مصنفہ نے بے حد مہارت کے بعد تحریری زبان دی ہے لیکن جسارت اور جدوجہد کی اس جنگ میں بے شمار سچائیاں سامنے آئی ہیں۔ یہاں تک کہ خود مصنفہ بھی سچ کے ان کانٹوں سے اپنا لباس تار تار ہونے سے نہیں بچا سکیں۔ زیر طبع تقریباً 300 صفحات پر مشتمل"۔ (کائنات بھر سناٹا از نفیس بانو شمع، صفحہ:128)۔

کتاب کے تعلق سے ناشر کے اس اشتہار سے نفیس کے مداحوں کے دلوں میں اک طرح کی دلفریب انگڑائیاں جنم لینے لگیں اور وہ خوشی و اطمینان کے جذبات سے سرشار نظر آنے لگے کہ اب ان کو ان کے محبوب قلمکار کی جادو بیاں خودنوشت کے دوسرے حصے کے مطالعے کی لذت کا موقع جلد ہی ہاتھ آجائے گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد کے مصداق ان کے اس توقع کی تکمیل جلد نہ ہو سکی اور اس خواہش کی اب 2021 میں پورے 21 سالوں کے لمبے انتظار کے بعد تکمیل ہو رہی ہے۔ لیکن خواہش کی تکمیل ہو رہی ہے یہ کیا کم ہے کہ ان کی محبوب قلمکارہ صحت کے ہزار مسائل اور وسائل کی لاکھ آزمائشوں کے باوجود اپنے اک دیرینہ خواب کو انجام تک پہنچانے میں کامیاب و بامراد ہو رہی ہیں۔ نفیس کی اس کامیابی پر دل کی گہرائیوں سے انھیں ان کے مداح ہدیۂ تبریک پیش کر رہے ہیں تو اس موقع پر نفیس اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

"آپ بیتیوں کا درمیانی وقفہ یوں تو برسوں پر محیط ہے مگر ایسا لگتا ہے وقت گزر کر بھی نہیں گزر رہا ہے۔ اپنی ہر بات سچائی اور دیانت کے ساتھ قلم کے حوالے کر دی ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس بار پھر جنبشِ قلم بے باک ہوگئی ہے۔ میری یہ آپ بیتی آپ کو ضرور احساس دلا دے گی کہ

عیاں نہ کی کبھی خود پر بھی زندگی میں نے
بڑے سلیقے سے کر لی ہے خودکشی میں نے

نفیس کی خودنوشت کے پہلے حصے "جنت سے نکالی حوا" کا مطالعہ جن قارئین نے کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ نفیس مرد اساس سماج کی ایک باغی قلمکارہ ہیں اور جن سفید پوشوں نے کسی بھی طرح سے عورت کو آبجیکٹیفائی کیا ہے اور ان کا استحصال کیا ہے، اس کے خلاف وہ شمشیر بے نیام ہو کر لکھتی ہیں۔ وہ اپنی ان خودنوشتوں اور دیگر تحریروں کے توسط سے نہ صرف خود کے اوپر ہو رہے استبداد کے خلاف لکھتی ہیں بلکہ سماج میں جہاں بھی عورت کو بیوی، محبوبہ یا طوائف کے طور پر ہی سہی ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے، ان سب کے خلاف ببانگ دہل لکھتی ہیں۔ ان کی یہ کہانی ان کے اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی ان کی ماں کو ان کے فوجی باپ نے جب محبوبہ کے شرط کی وجہ سے طلاق دے دیا تو یہیں سے حوا کا گھر سے نکالے جانے کے استعارے کا کہانی کے طور پر استعمال شروع ہوتا ہے اور اپنی سہیلیوں، شناساؤں اور آخر میں خود کے طلاق یافتہ ہونے پر کہانی کا کلائمکس عروج کا مرحلہ طے کر لیتا ہے اور پھر وہ ممبئی سے نقل مکانی کر کے دہلی آجاتی ہیں اور یہیں کی ہو رہتی ہیں۔ شوہر کی بے رخی ان کو ادب کے کوچے کی سیر کرنے پر مجبور کرتی ہے اور آہستہ آہستہ ظلم کے ارتقاء کے ساتھ ان کا فن بھی ارتقائی مراحل طے کرتا رہتا ہے اور جنت سے نکالی ہوئی حوا کی کہانی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر شوہر کی طرف سے ان کو بے رخی برداشت نہ کرنی پڑتی تو شاید وہ ادب کے کوچے میں داخل بھی نہ ہوتیں۔ اس لیے قاری ان کی کہانیوں کو پڑھ کر اپنی زندگی اور اس کے آس پاس کی کہانیوں سے ربط جوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نفیس کی کہانی انھیں اپنی کہانی لگنے لگتی ہے۔ خودنوشت کے پہلے حصے میں جن کہانیوں اور واقعات کے بیان میں تشنگی رہ گئی تھی، نفیس نے ان کو اپنی خودنوشت کے اس دوسرے حصے میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور دہلی میں معاشی سرگرمیوں کے ساتھ جڑنے اور ہم آہنگی بٹھانے کے لیے انھیں جن محسنین نے اپنا تعاون پیش کیا تھا، ان سب کا تفصیلی ذکر خودنوشت کے اس حصے میں قاری کو مل جائے گا۔ اس طرح سے "وقت مجھے لکھ رہا ہے" "جنت سے نکالی ہوئی حوا" کا ایک خوبصورت اور ضروری تتمہ تھا، جواب منظر عام پر آ گیا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ منفرد اسلوب و انداز کی اس خودنوشت کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور شوق کی آنکھوں سے لفظ بہ لفظ پڑھا جائے گا۔ خودنوشتوں کے دلدادہ قارئین نفیس کی اس دلچسپ اور کامیاب آپ بیتی کو مصنفہ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ □□□

Shahid Habib Falahi
Research Scholar,
Maulana Azad National Urdu University
Lucknow Campus
504/122,Tagore Marg,
Near Nadva College, Daliganj
Lucknow-226020 (U.P)
Mob+.918539054888/7053234784

جہانِ نسواں

اختر النساء

# ایران وہندوستان کے لسانی وثقافتی روابط

ایران و ہند کے تعلقات آریوں کے عہد سے ہی بہت گہرے ہیں، کیونکہ دونوں ایک ہی ''جڑ'' کی دو شاخیں ہیں دونوں ایک ہی قوم ''آریہ'' سے نکلی ہوئیں ہیں اور الگ الگ خطے میں جابسی ہیں۔لیکن الگ ہونے کے باوجود ان کے لسانی وثقافتی رابطے برابر جاری رہے، ان قوموں کی قدیم زبان سنسکرت واوستا کے لفظوں میں کافی حد تک مماثلت ہے، جس بنا پر مورخین ومحققین نے دونوں زبان کو سگی بہن کہا ہے، دونوں زبان و ادب، سیاسی وسماجی ماحول میں ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں، ایران میں زرتشت کی آتش پرستی اور ہندوستان میں اگنی کی پوجا ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہے۔اوستا کے شلوک اور سنسکرت کے منتر کے تلفظ ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتے ہیں۔

سنسکرت اور اوستا کے چند الفاظ جو آپس میں کافی مشابہت رکھتے ہیں درج ذیل ہیں۔

| سنسکرت | اوستا | سنسکرت | اوستا |
| --- | --- | --- | --- |
| میترا | متھرا | اشترا | اشترا |
| گئو | گاؤ | موش | موش |
| ونا | ونا | روچ | روچ |
| مشتی | مشتی | زشت | ہست |

اسی طرح ہندستانی مذہب یعنی بدھ دھرم اور جین دھرم کو ایران میں کافی تقویت ملی، ایران میں جگہ جگہ بدھا کے مجسمے بنائے گئے، اس کے علاوہ ایرانی مانویت کا پیغمبر مانی جو کہ ایک ایرانی تھا لیکن مورخوں کے قول کے مطابق اس نے بدھ دھرم سے مانوس ہوکر ہی اپنے دین یعنی مانویت کی بنیاد رکھی ساسانی بادشاہ شاہ پور اول کے عہد حکومت میں اس نے اپنے مختص تعلیم کا آغاز کیا جس کو بہت زیادہ مقبولیت بھی ملی تھی بلکہ پورے ایران میں اس عہد میں اس کا پرزور خیر مقدم کیا گیا تھا خود بادشاہ نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ بلکہ اس کو ایران یہاں تک کہ مرکزی ایشیاء میں بھی خوب سراہا گیا۔

ساسانی بادشاہ ہندوستانی راجاؤں سے اپنے تعلقات قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ کوشش کرتے رہتے تھے۔نہ صرف تحفے تحائف کا لین دین جاری رہتا تھا بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے یہاں شادی بیاہ بھی کرتے تھے۔

امرت لعل عشرت کے مطابق:

جب ساسانی حکمران بہرام گور ہندوستان آیا اور اس نے قنوج کے راجہ شنگل سے ملاقات کی اس کے بعد اس نے اس کی بیٹی سے شادی کرلی، اسی طرح نوشیروان عادل شاہ نے اپنے لڑکی کی شادی راجپوت راجہ سے کی تھی، اسی بادشاہ کے عہدے حکومت میں ہندوستان کی مشہور و معروف کتاب پنچ تنترا کا پہلوی میں ترجمہ کیا گیا، اس کتاب کا موضوع، سیاسی سماجی، طب، اخلاق وحکمت ہے، جو آج بھی ہندو ایران میں کلیلہ ودمنہ کے نام سے معروف ہے۔جس کا کئی بار عربی وفارسی میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔

اسی طرح علم اسلام جس وقت ایران میں لہرایا، اس عہد میں اکثریت کی تعداد میں ایرانی زرتشت ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے، اور

یہیں کے ہو کر رہ گئے جو کہ بعد میں پارسی کہلائے، جن کی نسل آج بھی یہاں ہندوستانی باشندے کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔

اس کے برعکس ہندوستان میں ایرانی سیاسی وسماجی، علوم وفنون کا آغاز ترکی وایرانی حکمراں کے آنے سے ہوا، سب سے پہلے جب محمد بن قاسم ملتان میں تخت نشین ہوا تو اس کے ہمراہ ایران کے علماء وفضلاء اور دوسرے فن کار ہندوستان تشریف لائے، ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئے، جن کے ذریعہ ایرانی لسانی وثقافتی، سیاسی وسماجی تعلیم ہندوستان کے گوشہ وکنار میں پھیل گئی۔

لیکن ہندوستان اور ایران کی لسانی ثقافت کا آغاز مستقل طور پر دسویں و گیارھویں صدی عیسوی میں ایرانی سیاح البیرونی کے ہندوستان میں آمد سے ہوا، البیرونی کا پورا نام ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، بیرون نامی علاقے میں ولدت کی وجہ سے البیرونی کے نام سے مشہور ہوا، یہ ایرانی الاصل تھا، اس کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کا ہے، یہ ایک محقق، سائنس دان، فلسفی جغرافیہ دان، منجم، ماہر لسانیات، ماہر انسانیات تھا، اس کو فارسی، عربی، سنسکرت، یونانی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی، انھوں نے ہی ہندوستان کی تاریخ، رسم ورواج، اور ہندوستانی عقائد کے بارے میں مستند کتاب لکھی ہیں، ہند کی مشکل ترین زبان سنسکرت کو سیکھ کر خود براہ راست سنسکرت کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اور خود یہاں کے ویدوانوں سے سیکھ کر اپنی کتاب ''تحقیق ماللھند'' کو تصنیف کیا ہے، جو آج بھی بہت اہم ہے،

اس کے علاوہ اس کی آمد کے کچھ عرصے بعد جب سلطنت دہلی ہندوستان میں قائم ہوئی تو فارسی زبان ہندوستان کی درباری زبان بن گئی۔

اس عہد سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی تک ایرانی علما، فضلا، صوفیا، ادبا، فن کار، معمار کا ہندوستان میں تشریف آوری کا سلسلہ قائم رہا، یہاں پر ان کے مرتبے کے مطابق حوصلہ افزائی کی گئی۔ ان کی آمد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت ایران میں کبھی چنگیزیوں کے فتنے رہے تو کبھی صفیوں کے تشدد جاری تھے۔ اس کے برعکس ہندوستان اس وقت امن وامان کا گہوارہ تھا۔ یہاں کے بادشاہوں ہر آنے والے نووارد کا تہ دل سے استقبال کرتے تھے، انعام واکرام سے نوازتے تھے، ان کی خوب حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے، یہاں کی زبان وثقافت کو اپنا لیا، اس کے بعد بڑے بڑے شعراء وادباء نے نا صرف فارسی زبان میں اپنے ہنر کے جوہر دکھائے بلکہ ہندوی زبان کی آمیزش سے اپنے کلام کو چار چاند لگائے، ان میں امیر خسرو، شیخ جمالی وغیرہ بہت مشہور ومعروف ہیں۔

مثال کے طور پر امیر خسرو کے چند اشعار ملاحظہ ہو!

زحال مسکین مکن تغافل دورائے نینا بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ایرانی علما، فضلا، صوفیا، ادبا کے علاوہ خود یہاں کے بادشاہوں نے بھی ہندوستان کی سرزمین، آب وہوا، جغرافیہ، تہذیب وتمدن اور تاریخ پر فارسی زبان میں بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی، تزک بابری، آئین اکبری، لباب الالباب اور تزک جہانگیری وغیرہ، خود ہندوستان کی سنسکرت زبان میں لکھی گئی کتابوں، کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے، رامائن، مہابھارت، اتھرویدا، وغیرہ۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ گیارہویں، بارہویں، تیرہویں، صدی عیسوی میں ہی ہندوستان میں صوفیوں کا آغاز وعروج کا دور کہا جاتا ہے۔ ایران سے آئے ہوئے صوفیوں نے ہندوستان میں دین اسلام کے پرچم کو بلند کیا، وقت وحالات کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا، ہر بزرگ اپنے ملفوظات تحریر کیے، ان عظیم بزرگوں میں شیخ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء ہندوستان میں عالم اسلام کو بہت ہی خوش طبعی، وخوش دلی سے ثبت کر دیا، اور وقت حکمراں نے ان کے مزار تعمیر کرائے، آج بھی ان کے مزار موجود ہیں، اور لوگ ان کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں، وہاں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں،

ایرانی طرز پر ہندوستان میں نقش ونگار، فنون ولطیفہ، تعمیرات ہر طرف نظر آنے لگے۔ مسجد قوت الاسلام جو دہلی کی سب سے پہلی مسجد ہے، اس کے علاوہ کوہن دہلی، قطب مینار، فیروز شاہی مدرسہ، جامع مسجد، تاج محل، یہ سب ایرانی طرز پر ہی تعمیر ہوئے ہیں۔

جشن نوروز ہندوستان میں منایا جانے لگا، یہاں تک کہ حکمراں بھی جشن نوروز اپنے محل میں مناتے تھے، اسی طرح ایک مرتبہ سلطان کیقباد نے کیلوکھری میں جشن نوروز منایا، جس کی تصویر امیر خسرو نے اپنے شاعرانہ پرلطف انداز میں جشن نوروز ہند کے نام سے کھینچی ہے جو درج ذیل ہے۔

رفت چو خورشید برج حمل — نور شرف کرد بگیتی عمل
دور جہاں روز نواز سر گرفت — موسم نو روز جہاں در گرفت
شاہ دراں روز ہم از بامداد — قصر فلک مرتبہ را تاب داد
کنگرۂ قصر طرف بر طرف — تا بحمل رفتہ شرف بر شرف

صفحۂ نو طاق بیا را ستند     پردۂ زر بفت فلک خواستند
تخت زدند وتتق آویختند     عرش دگر بر زمیں انگیختند
چترز ہر سو بفلک سر کشید     ابر سر از شرم بجا در کشید
پنج طرف چتر چو مہر سپہر     شش جہت آراستہ زاں پنج مہر
ہمچو گل وسنبل و سوری بید     لعل و سیہ گلگوںسبز و سپید

مختلف کتابوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فن مصوری کی ابتداء تو چین سے ہوئی ہے لیکن ایرانیوں نے چینیوں سے اس کلا کو سیکھ کر اپنے ہنر سے اس میں چار چاند لگا دئے اور ایرانی آرایش، وزیب وزینت کا نمونہ پیش کیا، اس کی مثال کہیں اور بامشکل ملتی ہے۔ ہندوستان میں عہد مغول میں جتنی بھی تعمیرات عمل میں آئیں ان میں یرانی مصوری ہی کے جوہر نظر آتے ہیں۔ اور آج بھی ہندوستان کی خوبصورتی میں اضافے کا کام کرتے ہیں اس کی ایک عمدہ مثال آگرہ میں موجود تاج محل ہے جو کہ دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک عجوبہ ہے جسے دیکھنے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

ماخذ:۔

ایران صدیوں کے آئینے میں، امرت لعل عشرت
تاریخ ادبیات ایران، رضازادہ شفق
بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن
ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن
مصوری اور مصور، شیخ ممتاز حسین صاحب
جامع تاریخ ہند (عہد سلطنت)، محمد حبیب، خلیق احمد نظامی

□□□

**Akhtarun Nisa**
Dept. of Persian
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

**Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"**

## سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................ بتاریخ............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ............................................................

پتہ : ............................................................

............................................................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

صوفیہ پروین

# نالۂ شب گیر میں عورت کا احتجاج

یہ سننے میں کتنا عجیب لگتا ہے کہ ایک دور تھا جب عورتوں کی زندگی مردوں کی زندگی کا صرف ایک حصہ ہوا کرتی تھی۔ سماج نے ان کے خیالوں پر ایک ایسی گرفت لگائی کہ انھوں نے کبھی اپنے وجود تک کو محسوس نہیں کیا۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی طور پر عورتوں کا نام دور دور تک نہیں تھا وہ صرف مرد کے لیے صنف نازک، جنسی تسکین اور تفریح کا ذریعہ تھی ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ ہر دور میں اس کے حقوق کی حق تلفی کی گئی وہ حقیر اور ذلیل شے کی حیثیت رکھتی تھی ان کو مسلسل ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑتا اور تاریخ گواہ ہے، جب بھی ظلم وستم کی انتہا ہوئی تو اس کی تبدیلی میں کچھ تحریکیں بھی رونما ہوئیں جیسے 'ستی پرتھا، نوعمری شادیاں، تعلیم نسواں وغیرہ ان ہی میں سے ایک تحریک 'تانیثیت' کی تحریک ہے۔ تانیثیت لفظ ایک جدید اصلاح ہے جو لاطینی زبان کے لفظ (femina) سے منتخب کیا گیا ہے جس کے معنی 'نسوانی اوصاف رکھنا' ہے یہ ایک اصلاح کا نام ہے جسے معنی یا مفہوم میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عورت پر ہو رہے ظلم وزیادتی کے خلاف اٹھتی ہوئی آواز ہے عورت کے تعلق سے گاندھی جی کا ایک خوبصورت قول ہے۔

"Women is the companion of man gifted with equal mental capacity. "

((Modern History of india) by B.A Grover p)1

اگر کسی کامیاب شخص کا انٹرویو لیا جاتا ہے اور اس کی کامیابی کی وجوہات میں کسی ایک کردار کا نام پوچھا جاتا ہے تو اکثر جواب ہمیں یہ سننے میں آتا ہے کہ ماں، بیوی، گویا ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ عورت صرف عورت نہیں بلکہ مرد کی ہمدم اور ساتھی ہوتی ہے وہ خالق کائنات کی ایک خوبصورت شئے ہے جس کے بنا یہ پوری کائنات نامکمل ہے یہاں تک کہ اردو کے بڑے فلسفی اور شاعر علامہ اقبال عورت کے تعلق سے کہتے ہیں کہ:

وجود زن سے ہیں تصویر کائنات میں رنگ

تانیثیت کے حوالے سے سیما صغیر لکھتی ہیں:

"فیمنزم جسے اردو میں تانیثیت کے نام سے جانا جاتا ہے نسائی شعور ہے بیداری کا اعلانیہ ہے دور حاضر کا یہ وہ تانیثی شعور ہے جو عورت کو بحیثیت انسان، تہذیبی، سماجی، اور

اقتصادی طور پر مردوں ہی کی طرح آزادئی خیال کی وکالت کرتا ہے۔"

(تانیثیت اور اردو ادب روایت مسائل اور امکانات، سیما صغیر براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی2018،ص14)

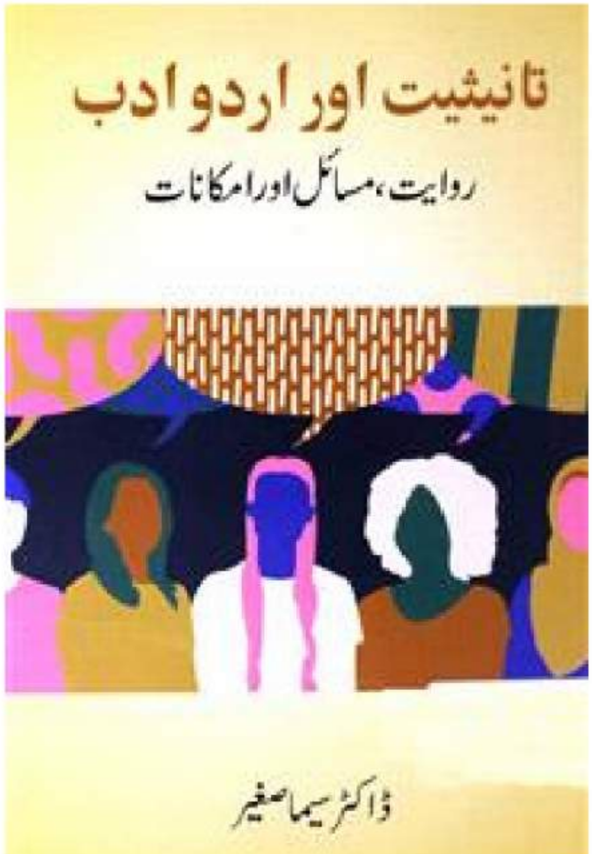


تانیثیت کی تحریک باضابطہ طور پر کب شروع ہوئی اس میں اختلاف ہے لیکن مورخین کا کہنا ہے کہ اس کی شروعات انیسویں صدی میں فرانس میں ہوئی۔اس پر پہلی کتابMarry Wollstonecraft کی "A Vindication of the Rights of Women:"یہ کتاب تانیثیت میں سنگ میل ثابت ہوئی۔جس میں پہلی بار عورتیں کے حقوق پر نظر ثانی کی گئی،خواتین کی وقار کی بات کی گئی،جائیدا میں حق،ووٹ دینے کا حق وغیرہ۔ان تمام حقوق کے لیے بڑے پیمانے پر آواز بلند کی گئی،خواتین میں بیداری دیکھی گئی۔ملک نے اس کی فروغ کے بدولت ہی خواتین کو پہلی بار ووٹ دینے کا حق دیا۔اس طرح اس کی شروعات سب سے پہلے نیوزیلینڈ(1893)میں ہوئی اور اس تاریخ کو سنہرے الفاظ میں درج کیا گیا،اس کے بعدUK, USAفرانس اور ہندوستان میں باقاعدہ طور پر قانون بنائے گئے۔

اس تحریک میں سب سے اہم نام سیمون دی بوار کا ہے ان کی کتاب "دی سیکنڈ سکس" کی آمد نے بالکل ویسی ہی ہلچل مچائی جیسے پریم چند کے افسانہ 'سوز وطن' نے۔اس کتاب نے بڑے پیمانے پر عورتوں کے حقوق کا مطالبہ کیا جنڈر (Gender) کی بات کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ Gender سماج کے ذریعے بنایا گیا ہے اس تعلق سے ان کا ایک مشہور قول ہے۔"لڑکیاں پیدا نہیں ہوتی بلکہ سماج کے ذریعے بنائی جاتی ہیں۔"

اگر ہم غور کریں تو لڑکیوں کو بچپن میں کھیلنے کے لیے گڑیا دی جاتی ہے اور لڑکوں کو طمنچہ یہاں تک سماج نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ گلابی رنگ لڑکیوں کا ہے اور نیلہ رنگ لڑکوں کا کیوں کہ گلابی میں داغ لگ جائے تو آنکھوں کو چبھتا ہے اور اگر نیلے رنگ میں داغ لگ جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

"لفظ "فیمنزم" کا استعمال سب سے پہلے فرینچ میڈیکل ٹیکسٹ میں (1871) کیا گیا۔کچھ عرصے بعد الیگزینڈر نے ایک کتاب لکھی "The Lady of the Camellias"اس میں انھوں نے اس لفظ کا استعمال ایسی عورتوں کے لیے کیا جو بہادر اور بے باک تھیں۔لیکن جیسے جیسے وقت اور حالات بدلتے گئے اس کے معنی میں بھی تبدیلیاں آتی گئی۔

اور اگر ادب میں تانیثیت کی بات کریں تو خصوصاً اردو ادب میں فیمنزم کو تانیثیت کے نام سے فروغ ملا، غزل،نظم،افسانہ،ناول وغیرہ میں فیمنزم کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔خصوصاً اردو ناول نالۂ شب گیر پر بات کرنے سے قبل ناول کسے کہتے ہیں اس پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

ناول ایک ایسا فن ہے جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے یہ ایک آرٹ ہے اس صنف میں کافی وسعت اور ہمہ گیری کی گنجائش ہوتی ہے زندگی کے اظہار کے امکان جتنے اس صنف میں ہیں وہ کسی دوسرے صنف میں نہیں گویا انسانی زندگی کے پیچ وخم، شکست وریخت،تضاد وتصادم پر اظہار وخیال کی جتنی آزادی ناول میں ہوتی ہے اتنی کسی دوسری صنف میں ممکن نہیں دور حاضر میں ناول محبوب و مقبول ترین صنف ہے کیونکہ جتنی مقبولیت ناول کو ملی اتنی کسی دوسری صنف ادب کے دامن میں نہ آسکی۔اسی لیے اکیسویں صدی کو ناول کی صدی کہا جاتا ہے اور اسی صدی میں اپنے ناولوں میں ایک نئی فکر کے ساتھ سامنے آنے والے مشرف عالم ذوقی ہیں۔ذوقی نے کم وبیش 15 ناول لکھے اور اپنے ہر ناول میں ایک نئے ومنفرد موضوعات کو پیش کیا۔ایک ایسا ہی سلگتا موضوع ناول 'نالۂ شب گیر' کا ہے جسے انھوں نے ناول کا موضوع بنایا۔یہ

ناول عورتوں کے مسائل پر لکھا گیا ایک دلچسپ ناول ہے اس میں مصنف نے عورت کا ایک نیا چہرہ دکھایا ہے ایک ایسی عورت جو بغاوت کرنا جانتی ہے اس گلوبلائزیشن کے دور میں عورت مرد سے ہر میدان میں آگے ہے ہر مقابلے میں ایک سخت چٹان کی صورت میں پیش پیش ہے۔اس ناول کا انتساب ذوقی نے ''ہر اس لڑکی کے نام کیا جو باغی ہے اور اپنی شرطوں پر زندگی جینا چاہتی ہے'' ابتدائی صفحات پر مصنف نے اس تاریخ کی طرف اشارہ کیا جو آدم کی پیدائش کے بعد حوا کو اسی کے بطن سے پیدا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔یہ اشارہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ آدم کی پیدائش پر حوا کو بھی پیدا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت اور مرد کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم ہے ذوقی نے اس ناول میں سیمون دی بوار کے خیالات کو بھی پیش کیا ہے۔مصنف نے عورت کو بے بس دنیا سے نکال کر ایک نئی دنیا سے متعارف کروایا ہے اس نئی دنیا میں جدید عورت کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے اب ان کے پاؤں میں مذہب اور معاشرے کی بیڑیاں نہیں وہ ایک نئی لکیر بن کر ابھر رہی ہیں وہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہی ہیں جہاں وہ معاشرے کو یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ وہ مرد کی محتاج نہیں بلکہ وہ تنہا رہ سکتی ہے یہ نئی دستک ہے جہاں عورتیں آزادی کی نئی منزلیں طے کر رہی ہیں وہ اب صرف ایک جسم کا درجہ نہیں رکھتیں بلکہ وہ معاشرے میں خود کو ایک طاقت کی دیوی کے روپ میں پیش کر رہی ہیں۔

ذوقی نے اس ناول میں جونا گڑھ کی مسلم آبادی کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور عزت داروں کا پردہ چاک کیا ہے جو جنسی کھیل میں اس قدر فریفتہ ہو گئے ہیں کہ گھر کی معصوم بچیاں بھی ان کی شیطانیت سے محفوظ نہیں جہاں عورتوں کو روزمرہ کے اس جنسی کھیل میں زبردستی گھسیٹا جاتا ہے۔ انھوں نے اس پورے کھیل کو بہت ہی باریکی سے اور پوری بے باکی کے ساتھ عورتوں کے مسائل پر بحث کی ہے ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی ہے۔عورت کے تعلق سے زیادہ تر جو لکھا گیا ہے اس میں عورت مظلوم اور بے سہارا دکھائی دیتی ہے لیکن ذوقی نے اپنے ناول میں عورت کو ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے جہاں وہ ظلم کا بدلہ لیتی ہوئی نظر آ رہی ہے وہ خوف زدہ نہیں بلکہ اپنی بہادری کا اعلان کر رہی ہے۔

ناول 397 صفحات پر مشتمل عورت کی داستان ہے جو سات حصوں پر مشتمل ہے شروعات میں نعمان شوق کا شعر ہے

کوئی تو نالۂ شب گیر پہ باہر نکلے
کوئی تو جاگ رہا ہو گا دیوانے کے سوا

اس ناول میں صوفیہ مشتاق احمد اور ناہید ناز دو عورتوں کے حالات و مسائل کو ان کی سماجی اور نفسیاتی کیفیت کے مطابق پیش کیا ہے مصنف نے ناول کے تمام حصوں کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان تمام کرداروں سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔انھوں نے عورت کو ایک غراتی بلی کی شکل میں پیش کیا ہے اور مرد کو ایک چوہا کی شکل میں اس مثال کے ذریعے مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ نئی صدی عورتوں کی صدی ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر سراج احمد انصاری لکھتے ہیں:

''ناول نالۂ شب گیر مشرف عالم ذوقی کا ایک منفرد ناول ہے جو انھوں نے چھ ماہ میں تکمیل تک پہنچایا اور اس ناول کو تحریر کرنے کے لیے انھوں نے لکھنو کی سرزمین کا انتخاب کیا ہے مذکورہ ناول اردو ناول کے قاری کو اس وقت چونکا دیتا ہے جب وہ معاشرے کے استحصال کے بعد ایک عورت کی طرف سے پہلی بار انتہائی درجے کا احتجاج دیکھتا ہے ناول نالۂ شب گیر میں وہی عورت دیکھی جا سکتی ہے جو اپنی شرطوں کے مطابق زندگی جیتی ہے۔''

(فکشن تنقید تکنیک تفہیم مشرف عالم ذوقی کی تحریروں کے تناظر میں، ڈاکٹر منور حسن/ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی 2020 ص نمبر 294)

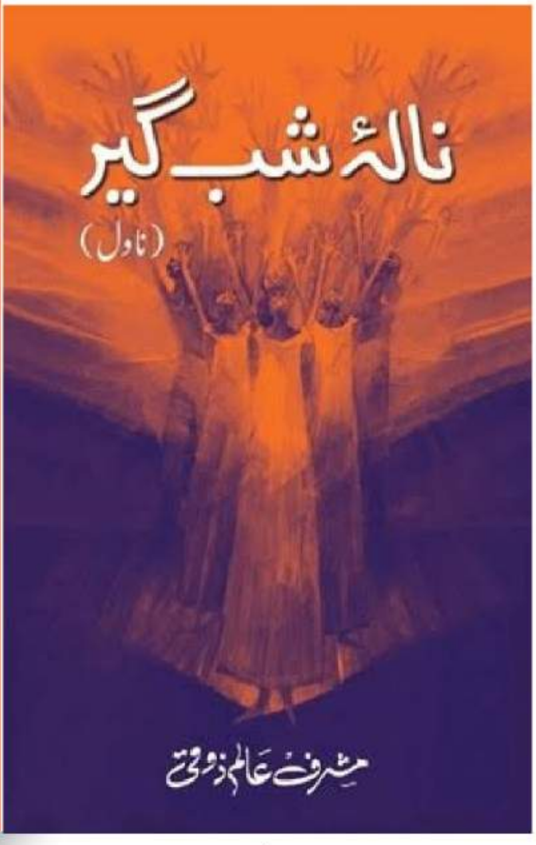

مشرف علم ذوقی اس کا ناول کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اس ناول کو تحریر کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ جب انھوں نے آنکھیں کھولی تو وہ دور 1962 تھا اور ناول کی تحریر 2015 میں مکمل ہوئی ظاہر ہے اس لمبے وقفے کے دوران انھوں نے سماجی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی طور پر صرف اس معاشرے کا جائزہ ہی نہیں لیا بلکہ مٹتی اور بنتی عورت کی تصویر، اس کی سسکیوں کو بھی انھوں نے محسوس کیا جس نے ان کو ناول نالۂ شب گیر جیسا ناول لکھنے پہ مجبور کیا۔

ناول نالۂ شب گیر کا پلاٹ دہرا ہے پہلے حصے میں صوفیہ مشتاق احمد ہے اور دوسرے حصے میں ناہید ناز مصنف نے ان دونوں کرداروں کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا ہے اور ان دونوں کی کہانیوں کے ذریعے ان کا تقابلی جائزہ لیا ہے انھوں نے دونوں مختلف کرداروں کو ایک الگ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اس طرح سے دیکھا جائے تو اس کا کینوس وسیع ہے۔

اگر کردار نگاری پہ بات کی جائے تو کہانی کے دو مرکزی کردار ہیں اور دونوں ہی خواتین ہیں پہلی صوفیہ مشتاق احمد اور دوسری ناہید ناز ایک ظلم کو سہنے والی ہے تو دوسرے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے والی ہے۔ پہلا کردار جس سے ہم ناول کے پہلے حصے میں ملتے ہیں وہ صوفیہ مشتاق احمد ہے جو بہت ہی معصوم ڈری سہمی ہوئی اور پڑھی لکھی خوبصورت وہ اپنے بھائی بہنوں کے طعنے سہتی ہوئی ایک ایسی لڑکی جس کے والدین کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ وہ اپنے خاندان کے بوجھ تلے دبی ہوئی اور بڑھتی عمر میں شادی نہ ہونے کی فکر سے خود کو ایک بوجھ تصور کرنے لگتی ہے اور وہ سب کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے جسے ایک ایسی عزت دار لڑکی سوچنے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ یہ کردار اس عورت کا کردار ہے جو صدیوں سے ظلم و ستم کو جھیلتی اور سہتی ہے یہ ظلم کا شکوہ تو کرتی ہے لیکن اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتی۔ اس کردار کے ذریعے ذوقی نے ہندوستان کا شریف گھرانوں کی لڑکی کی عکاسی کی ہے جو غریب ہیں جن کے پاس جہیز جیسی موٹی رقم دینے کا پیسہ نہیں ہوتا تا ایسے میں اسے اپنے خاندان والوں کے طعنے بھی سننے پڑتے ہیں اور ان کی کھوکھلی عزت بھی ڈھونی پڑتی ہے۔

بڑی مشکلوں کے بعد اس کے لیے ایک رشتہ آتا ہے لڑکا بڑی عمر ے ہوتا ہے جس نے شادی کرنے کے لیے یہ شرط رکھی کہ وہ شادی سے پہلے لڑکی کے ساتھ ایک رات گزارنا چاہتا ہے وہ معصوم خاندان کے بوجھ تلے اتنی دبی ہوئی تھی کہ شرط کو مان لیتی ہے اس کے گھر والے بھی اس کے فیصلے سے حیران تھے۔ اس کو معاشرے سے اتنی شکایت تھی کہ اس کا غصہ اس کے لفظوں سے ظاہر ہو رہا تھا ملاحظہ فرمائیں

"نظر جھکانے کی ضرورت نہیں دیکھنے پر ٹیکس نہیں لگا ہے ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا اسی لیے تمہاری اس شرط کے بارے میں سن کر کوئی تعجب نہیں ہوا یقین مانو میرے گھر والے نے سوچا تھا کہ یہ موم کی مورت تو برا مان جائے گی مگر میں نے آگے بڑھ کر کہا بہت ہو گیا آخری تماشہ بھی ختم کر ڈالو۔"

(ناول نالۂ شب گیر، مشرف عالم ذوقی / ذوقی پبلیکیشنز گیتا کالونی، دہلی 2015، ص نمبر 10)

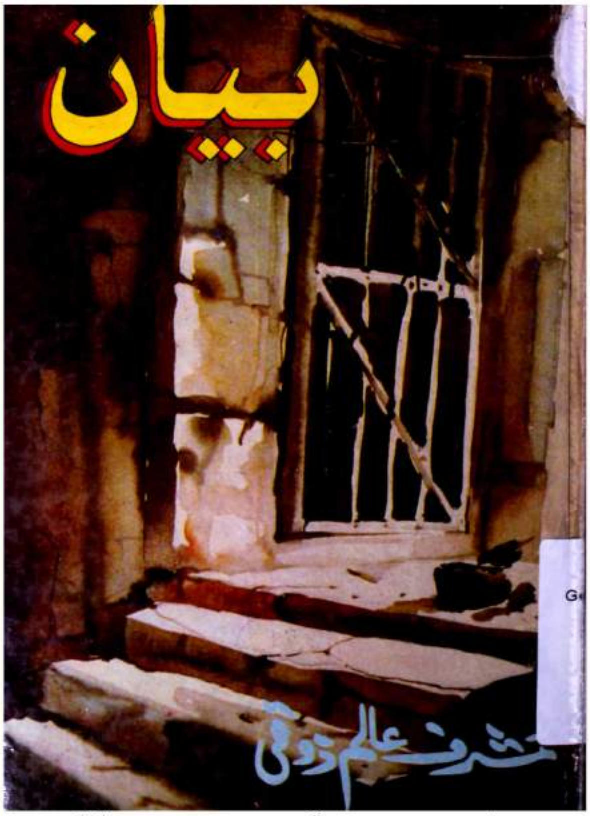


اس کردار کے ذریعے ذوقی نے ایک خوددار بے بس لڑکی کی عکاسی کی ہے جس کے سامنے ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں جسے وہ قبول کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہے اور اس قصے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔

دوسرا کردار جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ناہید ناز کا ہے جس میں مرد مخالف تانیثیت نظر آتی ہے یہ کردار صوفیہ کے کردار کے بالکل برعکس ہے جو شادی شدہ ہے اور ایک بچے کی ماں ہے لیکن یہ اس کی پہچان نہیں بلکہ اس کی اپنی ایک منفرد پہچان ہے وہ عورتوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے 'جوتی گینگ ریپ' کے احتجاجی مظاہرے میں شامل ہوتی ہے اور اپنے غم و غصے کا اظہار کرتی ہے وہ اس احتجاج میں سب کچھ بھول جاتی ہے اسے مرد ذات سے نفرت ہو گئی تھی ظاہر ہے بچپن میں اس نے اپنے خاندان میں جس جنسی کھیل کو دیکھا جہاں معصوم لڑکیاں اپنے رشتہ داروں

کی ہوس کا شکار بن رہی تھیں وہ بچپن سے ہی معصوم لڑکیوں پر ہونے والے جنسی استحصال کو دیکھتی ہے مگر وہ چپ نہیں رہتی اس کے خلاف احتجاج کرتی ہے اور اس کی بہادری کو دیکھ کر اس کی ماں جو ایک مورت تھی اس میں بھی جان آجاتی ہے۔ ناہید کے ذہن میں اس کی چچازاد بہن کی موت کا نقشہ بھی تھا جو اسی عزت کے نام پر ماری جاتی ہے۔ یہ تمام واقعات ناہید ناز کے لیے مرد ذات سے شدید نفرت کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

ناہید کو ایک لغت تیار کرنے کا پروجکٹ ملتا ہے اس کام کو مکمل کرنے کے بعد اسے مرد مخالف متن کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ کمال کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو بے قصور ہوتے ہوئے بھی ناہید کے سارے ظلم سہتا ہے وہ پڑھا لکھا نوکری یافتہ ہونے کے باوجود سب کچھ اپنی بیوی کی محبت میں قربان کر دیتا ہے جب ناہید تمام بے غیرت مردوں کا بدلہ اس سے لیتی ہے۔ تو وہ کہتا ہے:

''ناہید ناز کا عمل غلط ہو سکتا ہے مگر اس کی باتوں میں دم ہے یہاں صدیوں کی قید میں عورت ہے جس کا مردوں نے ہر سطح پر استحصال کیا ہے اور آج صدیوں کے ظلم سہنے کے بعد وہ عورت اگر ناہید ناز کے وجود میں سانس لے رہی ہے تو مجرم کیسے ہے غلط یہ ہے کہ مردوں کا یہ انتقام صرف مجھ سے لیا جا رہا ہے یعنی ایک ایسا مرد جو لڑنا بھی بھول چکا ہے۔''

(ایضاً ص نمبر 313)

اس اقتباس سے اس کردار کی بے بسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ صدیوں سے عورتوں پر ظلم ہوتا آ رہا ہے ایسے میں ایک عورت اس سے انتقام لے رہی ہے تو کچھ غلط نہیں۔ ناہید کے چلے جانے کے بعد وہ صوفیہ مشتاق احمد کو اپنا لیتا ہے لیکن صوفیہ اس کی بے پناہ محبت برداشت نہیں کر پاتی اور یہی احساس اس کے ذہنی بگاڑ کی وجہ بنتا ہے اس طرح سے کمال کو نہ تو ناہید کی محبت مل سکی اور نہ ہی صوفیہ مشتاق احمد کی محبت وہ ایک بے بس کردار نظر آتا ہے۔

زیر بحث ناول میں ذوقی نے ناہید کے کردار کے ذریعے جاندار مکالمے ادا کرائے ہیں جس کی مثال یہ ہے:

''اس طرح تو آپ مغرب کی حمایت کر رہی ہیں غیر ضروری آزادی کی حمایت کر رہی ہیں کیا آپ نے سوچا ہے ان خیالات کو فروغ مل جائے تو بے راہ روی میں اضافہ ہو جائے گا رشتوں کا فرق مٹ جائے گا مذہب اسی توازن کا تو ایک نام ہے۔

مجھے معاشرے مذہب آزادی کا خوف نہ دکھایئے آپ جیسے جونا گڑھ کے ہجڑوں نے مذہب کو عورت کو سماج کو صرف اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے یہ وراثت آپ سے ایک دن چھین لی جائے گی اور آپ مغرب کی بات کرتے ہیں معاشرہ کیا ہے یہاں لڑکیوں کو کوکھ میں ہی مار دیا جاتا ہے لڑکی ہو جاتی ہے تو اپنے رشتہ داروں کی جنسی جبلت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔'' (ایضاً ص نمبر 215)

اس مکالمے سے سماج کی اس حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہوتا ہے جو اپنے ہی گھر میں مہذب بن کے رہتے ہیں۔

مصنف نے منظر نگاری کی خوبصورت تصویر کھینچی ہے:

''ہری بھری گل پوش پہاڑی کے درمیان کئی خوبصورت کاٹیج نئے بنے ہوئے تھے خوشگوار موسم پہاڑی جھیلوں اور جھرنوں کی مترنم آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھی مرغزاروں کے درمیان سڑک پر کبھی کبھی کوئی سواری یا کار تیزی سے رینگ کر پہاڑیوں کی دوسری سمت میں اوجھل ہو جاتی ہے۔''

(ایضاً ص نمبر 102)

ذوقی کے اس ناول کے مطالعے سے یہ بات کا سامنے آتی ہے کہ وہ عورت کی آزادی کے قائل تھے۔ انھوں نے اس ناول کے ذریعے ایسے سوالات اٹھائے ہیں جس کا جواب نہ تو مذہب کے پاس ہے اور نہ ہی سماج کے پاس۔ ناول کے مطالعہ کے بعد قاری کے ذہن کے نئے نئے دریچے کھل جاتے ہیں۔ ناول کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس میں ایک عورت بدلہ لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مصنف نے وومن امپاورمنٹ پر یہ ناول لکھ کر اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس معاشرے سے عورت پر صدیوں سے ہونے والے مظالم کا جواب مانگا ہے۔ اس طرح سے ہم عورت پر پہلے سے ہوتے ظلم کو دیکھتے ہیں اور اس مظالم کے خلاف اس کا احتجاج بھی دیکھتے ہیں اور یہ احتجاج مسلسل جاری ہے۔

❑❑❑

**Sufiya Paveen**
Patel Chest, Christian Colony
Near- Church (New Prem ji Building-B27)
Room no.8
New Delhi-110007
Mobile.9116246950

# محمد شفیع مونس کی شاعری

ناہیدہ شفیع

مولانا محمد شفیع مونس ضلع مظفر نگر، اتر پردیش میں 1918 میں پیدا ہوئے۔انھوں نے ابتدائی دور میں غازی آباد میں بطور استاد اپنی خدمات انجام دیں۔آپ ایک بلند پایہ محقق ومفکر،صاحب طرز انشاء پرداز وادیب اور خوش فکر شاعر تھے۔ لہجے کی شگفتگی،اسلوب کی ندرت اور اظہار رائے میں بے باکی آپ کی تحریروں کا خاصہ ہے۔آپ نے اپنی زندگی کا کچھ عرصہ جیل میں بھی گزارا ہے۔اسلام کے لیے اپنی پوری زندگی کو وقف کرنے والے دین اسلام کے اس عظیم خادم نے 93 سال اس جہان فانی میں گزار کر 6/اپریل 2011 میں دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

معاشرے میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جب ہم کسی انسان کو مہذب کہتے ہیں تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فرد کے اخلاق واطوار،عقائد ورجحانات،لباس وخورونوش یہاں تک کہ ان کے طرز گفتگو میں ایک طرز کی موزونیت اور توازن ہوگا۔مولانا محمد شفیع مونس ایک ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے تمام فرائض کو پوری ایمانداری اور سنجیدگی کے ساتھ نبھایا۔اس بات کا اندازہ ان کے دو شعری مجموعے ''متاع حیات'' اور ''حروف آرزو'' سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''متاع حیات'' 1999 میں اور دوسرا ''حروف آرزو'' 2003 میں منظر عام پر آئے۔مولانا مونس کی شاعری روح کو تڑپانے والی اور قلب کو

گرمانے والی شاعری ہے۔ان کے تمام شعری کلام میں ایک درس اور ایک پیغام ہے۔ان کی شاعری ایک مخصوص فکری وتہذیبی پس منظر میں سانس لیتی ہے۔مولانا مونس اپنے شعری کلام کے ذریعے قوم کی توجہ مادہ پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔نمونہ کلام ملاحظہ فرمائے

یہ کھل جائے اگر ہم پر ہماری ابتدا کیا ہے
بہت آسان ہے یہ مسئلہ پھر انتہا کیا ہے
نہیں معلوم جس کو زندگی کا مدعا کیا ہے
وہ کیا جانے حقیقت کو بقا کیا ہے ، فنا کیا ہے

مولانا مونس شاعری برائے شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے سامنے کچھ خاص مقاصد تھے جن کی تکمیل کے لیے انھوں نے غزل کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔دراصل مولانا مونس جس دور میں تھے وہ نظریاتی اور سیاسی ہیجان کا دور تھا۔ ملت اسلامیہ زبوں حالی کا شکار تھی اور مولانا مونس ان حالات کے بارے میں فکرمند تھے۔ایسے حالات میں انھوں نے شاعری کے ذریعے سے بھی عوام کو اپنی عظمت رفتہ واپس لانے کے لئے جدوجہد کی تلقین کی۔

اٹھو خواب غفلت سے مونس اٹھو اب
کہ خورشید حق رونما ہو رہا ہے
شعور مدعا جہد وعمل کی شرط لازم ہے
نہ ہو گر سوز منزل خاک رہ چھانی نہیں جاتی
وفا کی راہ میں جب تک جگر خون ہو نہیں جاتا
نہیں کچھ اہمیت مونس کسی کے چارہ غم کی

"مولانا مونس کی شاعری اور زندگی ایک ھی سکے کے دو رخ ھیں۔ انھو ں نے جو کھاسچ کھا اور اثر و تاثیر میں ٹوب کر کھا۔ وحدت الوجود ان کا محبوب مو ضوع رھاھے ۔انسان کا مقام اور حیات و کائنات پربحث تصوف کے آئینے میں ان کی شاعری کے خاص جواھر ھیں۔ ان کی شاعری حقیقت اور مجاز کی ھم آھنگی کی بھترین مثال ھے ۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی مذھب کا دامن نھیں چھوڑا ھے ۔"

مولانا مونس کی شاعری اور زندگی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ انھوں نے جو کہا سچ کہا اور اثر وتاثیر میں ڈوب کر کہا۔ وحدت الوجود ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔انسان کا مقام اور حیات وکائنات پر بحث تصوف کے آئینے میں ان کی شاعری کے خاص جواہر ہیں۔ان کی شاعری حقیقت اور مجاز کی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی مذہب کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ان کے کلام میں تصوف کے مسائل اور صوفیانہ اشعار کی کثرت ہے۔کبھی کبھی امید اور ناامیدی کے درمیان کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔مایوسی اور ناامیدی کے سبب انسان کا ذہن مفلوج ہو جاتا ہے۔اس صورت حال میں امید ہی کا سہارا کام آتا ہے کیوں کہ امید ایک ایسی طاقت ور شے ہے جو انسان کی زندگی میں قدم قدم پر ساتھ رہتی ہے۔اس کے بغیر انسان کی پیچیدگیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔امید کسی خاص قوم،فرقہ،زبان یا نسل سے تعلق نہیں رکھتی ہے بلکہ اس میں آفاقیت ہوتی ہے۔امید جو ہر انسان کی ہم سفر ہوتی ہے اس کی توضیح وتشریح میں مولانا مونس نے مذہب،تاریخ اور عمرانی وتہذیبی عناصر کا سہارا لیا ہے

فقط ہیں پھول امیدوں کے دامن میں
یہ خواب ہم نے بھی کس سادگی سے دیکھا ہے

مولانا مونس کی شاعری میں عشق مجازی بھی ہے اور عشق حقیقی بھی اور ایسا بھی جہاں عشق مجازی کی سرحدیں باقی نہیں رہتیں لیکن ان تینوں طرح کے اشعار میں احساس کی صداقت واضح طور پر نظر آتی ہیں۔اسی لئے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا تاثیر ہے۔ان کے عشق میں ایک خاص قسم کی طمانیتِ قلب،سکون اور پاکیزگی ہے۔

مولانا مونس کی شاعری کائنات کی سچائیوں کا اعتراف ہے جن میں تعمیر وحیات کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔انھوں نے خود ہی اپنے لیے ایک منفرد راستے کا تعین کیا اور اپنی شاعری میں اسلامی،نفسیات،سماجی،اور تہذیبی موضوعات داخل کئے۔انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انسانیت کو بھی اپنی شاعری کے ذریعے سوچ،سمجھ اور پرکھ کا ایک منفرد پیغام دیا ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ فرمائے:

مجھے پیغام الفت عام کرنا ہے زمانے میں
یہ میرا فرض ہے جب تک ہے اپنی جاں میں جاں باقی
یہ رنگ و نسل میں تفریق توبہ
ہے گہری دشمنی اہل جہاں سے
وفا و مہر کا وہ عہد پھر آئے گا کب یا رب
جب انسان حرمت انسانیت کا قدرداں ہوگا

مولانا مونس کی شاعری کو ان کے زمانے کے معاشرتی اور فکری ماحول اور ان کی نجی شخصیت کے حوالے سے پڑھنا چاہیے۔ جہاں تک پیرائے بیان کا تعلق ہے تو وہ اپنی بات کو وضاحت اور خوبصوت انداز سے بیان کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں زبان و بیان کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو مولانا مونس زبان کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ الفاظ کی ترکیب اور محاوروں کا صحیح استعمال پر بھی زور دیتے تھے۔ بقول سید سعادت اللہ حسینی:

''چنانچہ وہ زبان کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ وہ پہلے ہمارہ قراردادوں، بیانات اور دیگر تنظیمی تحریروں کی نوک پلک درست کرتے تھے۔ بعد میں جب میری تحریریں شائع ہونے لگی تو ان کی زبان کی غلطیوں پر بھی کبھی توجہ کر دیا کرتے تھے۔ الفاظ کی ترکیب اور قوائد کے پاس ولحاظ ہی میں نہیں بلکہ محاورہ اور روز مرہ میں بھی کسی غلطی کے وہ روادار نہیں تھے۔ 'روز و شب نہیں، محاورہ شب و روز ہے' کروانا نہیں کہتے، کرانا کہتے ہیں۔ یہ واو کا اضافہ ہم لوگ نہیں کرتے یہ جنوب کی زبان ہے۔''

(ایک عہد کا خاتمہ از سید سعادت اللہ حسینی، مشمولہ مضمون، ماہ نامہ صلاح کار، نئی دہلی، اپریل 2013، ص۔34)

مولانا مونس کی شاعری میں فکر انگیز جوش بیان اور صحت مند روایات کا اظہار ملتا ہے۔ ان کا جذبہ و مستی ان کی غزلوں کی روح رواں اور جان ہے۔ ان کی شاعری میں ایک ایسا تنوع ہے جو آج کی نوجوان نسل کو کچھ کر گزرنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک کامل مسلمان اور سلجھا ہوا دانشور بھی عطا کرتا ہے۔

جذب صادق ہو تو بر آتی ہے دل کی آرزو
کون کہتا ہے کہ ہر فریاد بے تاثیر ہے
مختصر سی زندگی کے سو تقاضے ہیں تو کیا
ہمت مردانگی عزم جواں رکھتا ہوں میں

مولانا مونس کی شاعری میں عشق و عقل، جبر و اختیار، خلوت و انجمن، سفر در سفر، بے ثباتی و بے اعتباری، بقا اور فنا، مکان و لامکان، موحدت و کثرت اور جز و کل کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی ایک خاص آرٹ ہے۔ سیدھی اور سچی بات کو مختصر ترین الفاظ میں بیان کرنے پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے حسرت و غم کا بیان اور دردِ تنہائی کی کیفیت کو بڑے پراثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انسان وہی ہے جسے دوسروں کا درد دیکھائی دے، اس بات کا ذکر اردو ادب کے مشہور و معروف شاعر خواجہ میر درد نے بھی کیا ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

مذکورہ خیال کو مولانا مونس نے بھی اپنی شاعری میں نظم کیا ہے

نہیں گر دل میں درد آدمی تو کچھ نہیں مونس
اسی ساز محبت سے بھرم قائم ہے انسان کا
حقیقت میں دکھی دنیا کا جو غم خوار ہوتا ہے
وہ انسانی شرافت کا علم بردار ہوتا ہے

ان کی غزلوں میں فکر انگیز جوش بیان اور صحت مند روایات کا اظہار ملتا ہے۔ ان کا جذبہ و مستی ان کی غزلوں کی روح اور جان ہے۔ تشبیہات و استعارات، اصلیت و جوش اور شاعرانہ مصوری ان کی شاعری کی خاص جوہر ہیں۔ ان کے کلام میں اچھی اور معیاری شاعری کی تمام لوازم پائے جاتے ہیں۔ مثلاً تاثیر، شائستگی، نزاکت اور نغمگی سبھی ان کے شعری کلام میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و درد بھی ہے اور حسن کی تعریف بھی۔ ان کی شاعری انسانی ضمیر کو روشن کرتی ہے۔ مولانا مونس کی زبان میں بے ساختگی اور سلاست ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اسے نہایت ہی سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا ہے۔

سخن کے ساتھ ہو شائستگی طرز سخن میں بھی
کہ نامحمود انداز شریفانہ نہیں ہوتا
سخن میں سوز ہو وہ سوز جو دل میں اتر جائے
اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر زورِ قلم کیا ہے

مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا مونس نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو انقلابی سوچ کے ساتھ ساتھ فکری طور پر بھی استحکام بخشا ہے۔ اپنے وقت میں وہ مظلوم اقوام کی سب سے مضبوط آواز بن کر ابھرے اور آج بھی ان کی شاعر ہمیں زندگی کا پیغام دیتی ہے۔

□□□

**Nahida Shafi**
Research Scholar
University of Delhi, Delhi
Phone No : 7889333635
Email ID: nahidashafi02@gmail.com

# خواتین کی تعلیم اور خواندگی کی ذمہ داری

ڈاکٹر شفاعت احمد

ہندوستانی ثقافت میں عورت کے کئی روپ ہیں، اس کی کئی خصوصیات ہیں، اس کے کئی امتیازات ہیں اوران سب میں اس کی عظمت کا اشارہ پایا جاتا ہے، چنانچہ ہمارے یہاں عورت کو تخلیقیت کا سرچشمہ، تمام دیوتاؤں کی ماں، تمام برائیوں کو فتح کرنے والی اور تمام نعمتوں کی فراہمی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے خدائی طاقت کا مظہر سمجھا جاتا ہے، جس سے تمام مخلوقات پیدا ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں مختلف ناموں اور شکلوں میں اس کی عبادت اور عقیدت کے ساتھ پوجا بھی کی جاتی ہے۔

مگر اس سب کے باوجود زمینی سطح پر ہمارے یہاں عورتوں کے تئیں تضاد اور دوعملی نظر آتی ہے۔ ایک طرف ہم اپنی حفاظت کے لیے 'ماں درگا' کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور دوسری طرف ہم نسائی اصولوں اور تانیثیت کے خیالات کی مذمت کرتے ہیں، انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھیں تمام ناکامیوں کا سبب، ہوسناکی اور مصائب کا ذریعہ باور کرتے ہیں۔ اس دوہرے پن کی وجہ سے ایک ہندوستانی عورت پیدائش سے ہی اپنے دماغ و دل دونوں میں ایک قسم کا غصہ پالے رہتی ہے۔ وہ انسانی معاشرے میں اپنے حقیقی کردار، مقام اور شناخت کو سمجھنے کے لیے جدوجہد کرتی رہتی ہے، وہ ایک قسم کے مخمصے میں رہتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ آیا اس کا تعلق اپنے چاروں طرف پائی جانے والی دیویوں کے قبیلے سے ہے یا ایسے طبقے سے جس میں بیٹی کی پیدایش پر آج بھی خوشی کے بجائے رنج وغم کا اظہار کیا جاتا ہے اور بہت سے گھریلوں جھگڑے، مارپیٹ اور زوجین میں علیحدگی تک کے واقعات محض بیٹی پیدا ہونے کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے میں ہندوستان میں خواتین کو قانونی، سماجی اور تعلیمی حقوق سے محروم نہیں کیا جاتا تھا، مگر عملی طور پر وہ عموماً گھریلو معاملات میں زیادہ مصروف و محدود رہیں اور یہیں سے ان کی سماجی ماتحتی کا آغاز ہوا۔ مگر اس طرح کی محکومی کے باوجود خواتین نے باہمت گھریلو ذمے دار، مضبوط ماؤں، شاہزادیوں اور ملکاؤں، حکمرانوں، بہادر جنگجوؤں، منتخب سماجی وسیاسی نمائندوں اور رہنماؤں جیسے اہم کردار ماضی بعید میں ادا کیے ہیں اور اسی وجہ سے جبر وانکار کے مختلف مظاہر کے باوجود انھوں نے تاریخ میں کئی بار حقیقی 'ناری شکتی' کا مظاہرہ کیا ہے۔

آج کے زمانے میں خاص طور پر ہندوستان اور عمومی طور پر تمام دنیا کے لیے آگے کا راستہ یہی ہوسکتا ہے کہ ناری شکتی کے ساتھ احترام، تعظیم، تجربات، حصول علم اور مواقع تک رسائی کے حوالے سے غیر

جانبدارانہ برتاؤ کیا جائے۔ کسی بھی جنسی تفریق سے بالاتر ہوکر لڑکے اورلڑکیوں کی اندرونی صلاحیتوں کا اعتراف ہونا چاہیے اور انھیں پختہ و کارگر بنانے پر توجہ دینی چاہیے۔ہندوستان، جو ثقافتی و مذہبی تنوع کی سرزمین ہے، جہاں درگا کی شکل میں ناری شکتی کی پوجا کی جاتی ہے، وہاں خواتین کی تعلیم وتربیت اور انھیں ہرقسم کے حقوق ومواقع فراہم کرنے پر توجہ دی جانی چاہیے۔

**کچھ اہم اعدادوشمار**

یہ توخواتین کے تعلق سے ہمارا مطلوبہ کرداراور ذمے داری ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔چنانچہ یونیسیف کے پیش کردہ اعدادوشمار کے مطابق دنیا بھر میں 129 ملین لڑکیاں اسکول سے باہر ہیں،جن میں 32 ملین پرائمری اسکول کی عمرکی ،30 ملین لوئر سیکنڈری اسکول کی عمرکی ، اور 67 ملین اپر سیکنڈری اسکول کی عمر کی لڑکیاں شامل ہیں۔

اسی طرح امریکہ کے ایک غیر منافع بخش ادارہ بورگن پروجیکٹ (Borgen Project) کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہر سال ہندوستان میں 23 ملین لڑکیاں اسکولوں میں سینیٹری نیپکن ڈسپنسر اور حفظان صحت کی مجموعی بیداری کی کمی کی وجہ سے ماہواری شروع ہونے کے بعد اسکول چھوڑ دیتی ہیں۔

نیشنل سروے آف انڈیا کے مطابق ہندوستان میں خواندگی کی شرح 2011 میں 73٪ سے بڑھ کر 2022 میں 7.77 فیصدرہوگئی ہے، تاہم یہ اب بھی عالمی شرح خواندگی سے پیچھے ہے، جو(یونیسکو کے مطابق) 5.86 فیصد ہے۔2022 میں 7.77 فیصد ہندوستان کی شرح خواندگی میں مردوں کی خواندگی کی شرح 7.84 فیصد ہے اور خواتین کی شرح خواندگی 3.70 فیصد ہے جبکہ عالمی سطح پرخواتین کی خواندگی کی شرح (یونیسکو کے مطابق)79 فیصد ہے۔

مردوں کے مقابلے خواتین میں خواندگی کی کم شرح ہونے کے کئی عوامل ہیں، جن میں سب سے بڑے اور سب سے اہم عوامل عدم مساوات اورصنف کی بنیاد پر امتیازی سلوک ہیں۔یہ امتیازی سلوک کبھی تولڑکیوں کی پیدائش کی راہ میں حائل ہوجاتا ہے اور کبھی انھیں تعلیم کے حق سے محروم کر کے گھریلو معاملات میں الجھادیتا ہے اور انھیں سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے محروم کردیتا ہے۔

خواتین میں کم شرح خواندگی کی دیگر وجوہات بھی ہیں، جن میں تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کا اندراج کم ہونا، بیچ میں تعلیم چھوڑنے کی شرح کا زیادہ ہونا، سماجی امتیاز، غیر محفوظ عوامی مقامات، والدین کے ذریعے لڑکوں کی تعلیم کو ترجیح دینا وغیرہ اہم اور نمایاں ہیں۔ایک اہم وجہ دیہی یا نیم شہری علاقوں میں یہ بھی سامنے آئی ہے کہ بہت سی زیادہ پڑھی لکھی خواتین کو مناسب رشتے ملنے میں کبھی کبھی تاخیر ہوجاتی ہے،تو انھیں دیکھ کر بہت سے والدین یہ سوچنے لگتے ہیں کہ لڑکیوں کو زیادہ نہیں پڑھانا لکھانا چاہیے ورنہ ان کی بروقت شادی مشکل ہوجائے گی۔یہ سوچنے کی وجہ وہی قدیم دقیانوسی سوچ ہے کہ لڑکی کا منصب بس یہ ہے کہ عمر کی ایک حد تک پہنچ کر اس کی شادی کردینی چاہیے اور اس کے بعد اسے گھر گرہستی اور

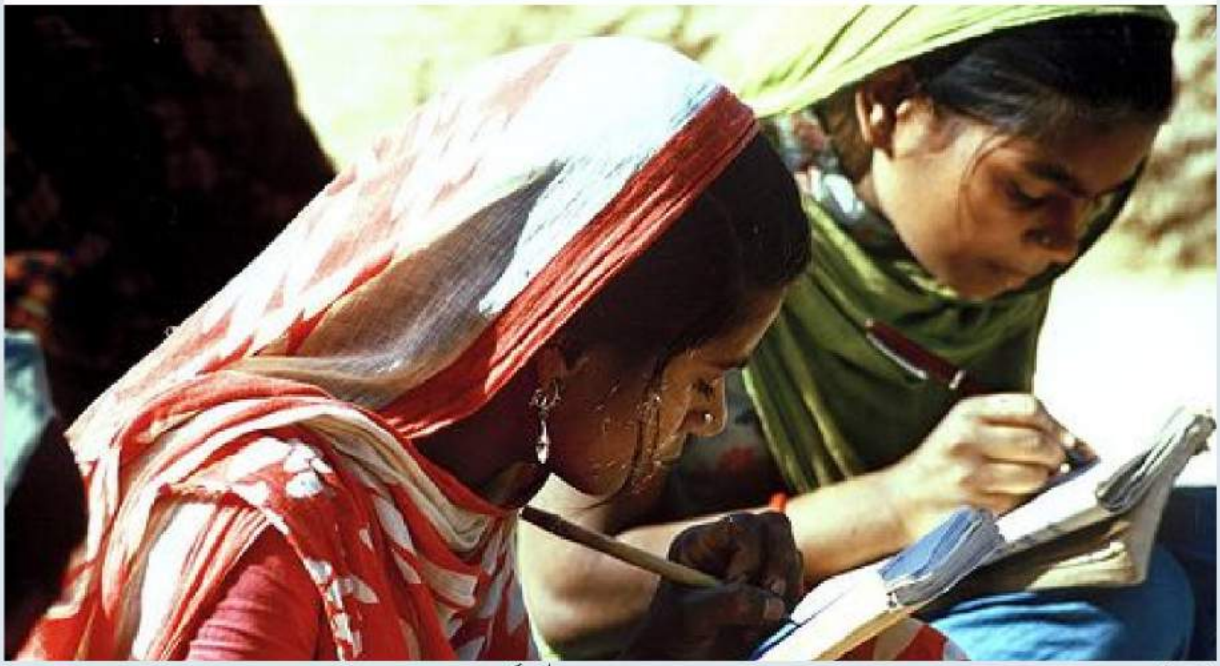

یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ صرف اس لیے برتر ہے کہ وہ لڑکا ہے جبکہ اس کے پاس اس نظریے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی ہے۔ جب خواتین مردوں کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں جا کر تعلیم میں حصہ لیتی ہیں، تو لڑکے ان کے تعلیمی حقوق سے آگاہ ہوتے ہیں اور اپنے تئیں احساس برتری ان کے اندر کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو تعلیم دلانے سے سماجی مساوات اور جمہوریت کے تصورات کو فروغ ملتا ہے۔

## غربت میں کمی

جب خواتین کو مساوی حقوق اور تعلیم تک رسائی حاصل ہوتی ہے، تو وہ کاروباری اور معاشی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ خاندان کے لیے کھانا، کپڑا مہیا کرنے اور اس کی آمدنی میں اضافہ کرنے سے یقینی طور پر اس کے خاندان اور مجموعی طور پر سماج کی غربت میں کمی آتی ہے۔ غربت آج بھی ہمارے ملک کے لیے ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے اور اس کی جہاں بہت سی دوسری وجوہات ہیں وہیں ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہمارے بہت بڑے سماجی طبقے میں آج بھی خواتین تعلیم سے محروم اور محض گھریلو مصروفیات تک محدود ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں گھر کی ساری ذمے داری گھر کے مردوں پر ہوتی ہے اور اگر وہ اپنی ذمے داری نبھانے میں ناکام رہے یا اعذار کا شکار ہو گئے تو پھر پورے گھر اور خاندان کا سماجی و معاشی نظام تباہ ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار دوسری خرابیاں سر ابھارنے لگتی ہیں۔ اگر تمام لڑکیاں اپنی تعلیم مکمل کریں اور افرادی قوت میں حصہ لیں، تو اس طرح وہ اپنے گھریلو معاشی نظام کو بہتر کرنے میں بھی حصہ لیں گی اور 'چائلڈز رائٹ اینڈ یو' کے مطابق ہندوستان 2025 تک ملک کے جی ڈی پی میں 770 بلین ڈالر کا اضافہ کر سکتا ہے۔

بہر کیف، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں خواتین کی تعلیم آج بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ زمینی سطح پر ہمارے یہاں صنفی مساوات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سماجی ذمے داروں کے ساتھ نئی نسل کو خود بھی سوچنا چاہیے اور جب قومی ترقی کی بات آتی ہے تو لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں طور پر تیار رہنا چاہیے۔ ہم ٹیکنالوجی، تخلیقی صلاحیتوں، خوبصورتی اور ترقیات سے بھرپور مستقبل کی دنیا کا تصور چار پیداواری عناصر میں سے ایک کو چہار دیواری میں بند کر کے کیسے کر سکتے ہیں؟ بچے چاہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں، کلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر ہم انھیں مناسب وقت پر کافی پانی اور سورج کی روشنی دیں، تو وہ صحت مندی کے ساتھ کھل کر پھول بن جائیں گے اور ایک دنیا کو اپنی خوشبوؤں سے مہکائیں گے۔ لہذا ہمیں بلا کسی تفریق کے لڑکوں کے ساتھ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کی بھی فکر کرنی چاہیے تا کہ قومی و معاشرتی ترقی میں وہ بھی اپنا مطلوبہ کردار ادا کر سکیں۔

□□□

Dr. Shafayat Ahmad
Associate Professor
MANUU,
College of Teacher Education
Darbhanga-846002 (Bihar)

ڈاکٹر محمد فیروز عالم

# خواتین کو بااختیار بنانے میں تعلیم کی اہمیت

بااختیار بنانے کو ایک ایسا سماجی ماحول پیدا کرنے کے ذریعے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے، جس میں کوئی فرد انفرادی یا اجتماعی طور پر سماجی تبدیلی کے فیصلے اور انتخاب کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ خودمختاریت علم، طاقت اور تجربے کے ذریعے انسان کی فطری صلاحیت کو مضبوط کرتی ہے۔ یہ کسی فرد کو خودمختار طریقے سے سوچنے اور عمل کرنے کے قابل بنانے کا عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے انسان اپنی قسمت اور اپنے حالاتِ زندگی پر قابو پاسکتا ہے اور آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے اور اپنی فکر کو عمل کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ بااختیاریت افراد کو اپنی صلاحیتوں کا ادراک واستعمال کرنے، اپنی سیاسی وسماجی شراکت کو بہتر بنانے اور اپنے اندر خوداعتمادی پیدا کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ کسی فرد کا بااختیار ہونا اس کا ذہنی، فکری وعملی اعتبار سے آزاد ہونا اور اپنے عزائم اور امنگوں کے مطابق اقدامات کرنا ہے۔ بااختیار ہونے سے مراد بے لگام آزادی یا جبرو استبداد نہیں ہے، بلکہ کسی فرد کا جائز اور دستوری بنیادوں پر مبنی حقوق اور وسائل سے لیس ہونا ہے۔

معاشرے میں ہمیشہ ایسے عناصر موجود ہوتے ہیں جو اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہوتے ہیں، لیکن انھیں خود اپنے حقوق کا شعور نہیں ہوتا۔ اگر ہم ایسے عناصر کی فہرست بنائیں، تو ان میں خواتین کا نمبر سب سے اوپر ہوگا۔ حالانکہ فی الحقیقت خواتین ہر معاشرے کا سب سے اہم عنصر ہوتی ہیں۔ اس حقیقت سے اگرچہ سب واقف ہیں لیکن کوئی بھی عملی طور پر اس حقیقت کو ماننے کو تیار نہیں۔ نتیجتاً آج کے معاشرے میں خواتین کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے۔ خواتین کو معاشرے میں ثانوی درجے پر پہنچانے اور انھیں ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے ہی خواتین کو بااختیار بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی، جس کے نتیجے میں آج خواتین کو بااختیار بنانے پر کافی بحث ہورہی ہے اور یہ موضوع دنیا بھر میں توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ آج ہم ایک آزاد ملک کے شہری کے طور پر زندگی گزار رہے ہیں، لیکن ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہمارے ملک کا ہر شہری واقعی آزاد ہے یا وہ حقیقی معنوں میں آزادی سے لطف اندوز ہو رہا ہے؟ مردوں اور عورتوں کے درمیان عدم مساوات اور خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک پوری دنیا میں ایک پرانا مسئلہ ہے۔ اس طرح مساواتِ مرد وزن کی کشمکش ایک عالمگیر ایشو ہے۔ مساوات کی اس جدوجہد کی وجہ سے ہی قومی و عالمی سطح پر خواتین کی بہت سی انجمنیں اور تحریکیں رونما ہوئی ہیں۔ ہمارے ملک کا آئین مرد اور عورت کے درمیان تفریق نہیں کرتا، لیکن ہمارے سماج نے خواتین کو بہت سے بنیادی حقوق سے محروم رکھا ہے، جو انھیں ہمارے آئین نے عطا کیے تھے۔ یہی حال دنیا

کے دوسرے بہت سے ملکوں کا بھی ہے۔

**تعلیم کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنانا**

اسی وجہ سے خواتین کو بااختیار بنانا کسی بھی معاشرے، ریاست یا ملک میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ عورت ہی ہے جو بچے کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔خواتین ہمارے معاشرے کا ایک اہم حصہ ہے۔تعلیم کو اگر خواتین کو بااختیار بنانے کا ذریعہ بنایا جائے تو معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی آ سکتی ہے، اس لیے یہ ہندوستان کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ ہندوستان کا آئین حکومت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ خواتین کو بااختیار بنانے کے طریقوں اور ذرائع کو تیز کرنے کے لیے مثبت اقدامات کرے۔اس ضمن میں تعلیم خواتین کی زندگی میں نمایاں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔تعلیم خواتین کو بااختیار بنانے کا سنگ میل ہے کیونکہ یہ انہیں چیلنجوں کا جواب دینے، اپنے روایتی کردار کا مقابلہ کرنے اور اپنی زندگی کو بدلنے کے قابل بناتی ہے، لہذا ہم خواتین کو بااختیار بنانے کے حوالے سے تعلیم کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔اگر خواتین کی تعلیم میں کما حقہ ترقی ہوتی ہے تو مستقبل قریب میں ہندوستان دنیا کا سوپر پاور ملک بن کر ابھر سکتا ہے۔خواتین کے سماجی کردار وحالات میں مثبت تبدیلی کا واحد ذریعہ اسی کو مانا جاتا ہے کہ انھیں سماجی سطح پر بااختیار بنایا جائے اور خواتین کو بااختیار بنانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ان کی اعلیٰ تعلیم کا نظم کیا جائے۔گویا سوپر پاور بننے کے لیے ہمیں سب سے زیادہ توجہ خواتین کی تعلیم پر مرکوز کرنی ہوگی، جس کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنانے پر زور دیا جائے گا۔ یونائیٹڈ نیشنل ڈیولپمنٹ فنڈ برائے خواتین (UNIFEM) کے مطابق خواتین کو بااختیار بنانے کی اصطلاح کا مطلب ہے:

۔صنفی تعلقات کی معلومات اور سمجھ حاصل کرنا اور ان طریقوں کو سمجھنا جن کے ذریعے ان تعلقات میں بدلاؤ آسکتا ہے۔

۔ اپنے آپ کو پہچاننا، معاشرے میں مطلوبہ تبدیلی لانے کی صلاحیت کا اعتراف اور اپنی زندگی کو خود کنٹرول کرنے کے حق پر یقین۔

۔مختلف چیزوں/امور میں سے کسی ایک یا زائد کے انتخاب کی صلاحیت پیدا کرنا۔

۔سماجی تبدیلی کی سمت کو منظم کرنے اور اس پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت کو فروغ دینا، قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک زیادہ منصفانہ سماجی اور اقتصادی نظام قائم کرنا۔

اس طرح بااختیار بنانے کا مطلب ہے ذاتی کنٹرول یا اثر ورسوخ کا نفسیاتی احساس اور حقیقی سماجی اثر ورسوخ، سیاسی طاقت اور قانونی حقوق سے آگاہی پیدا کرنا۔ یہ ایک کثیر سطحی عمل ہے جس کا تعلق افراد، تنظیموں اور پورے سماج سے ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی پیمانے پر جاری رہنے والا عمل ہے، جس کے ذریعے وسائل سے محروم افراد وطبقات کو ان تک رسائی کے قابل بنایا جاتا ہے اور اسی کو دوسرے لفظوں میں بااختیار بنانا کہا جاتا ہے۔

اگر ہم اپنے ملک میں 1901 سے لے کر 2011 تک کی مردم شماری میں مردوں اور خواتین کی شرح خواندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو افسوسناک صورتحال کا سامنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر 1901 میں مردوں کی شرح خواندگی ہمارے یہاں 8.9 فیصد تھی تو خواتین کی شرح خواندگی 7.0

فیصد تھی جو 2011 میں مردوں میں 82 فیصد اور خواتین میں 65 فیصد پر پہنچ سکی ہے اور 2022 میں یہ تناسب 84 فیصد اور 70 فیصد تک پہنچا ہے۔یعنی آج بھی ہمارے ملک میں مردوں اور عورتوں کی تعلیم کی شرح میں بڑا تفاوت ہے۔ نتیجے کے طور پر آزادی کے 75 سال بعد بھی خواتین ہماری سماجی درجہ بندی میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ اس لیے جب تک ہم خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو تسلیم نہیں کریں گے تب تک انھیں بااختیار بنانا ممکن نہیں ہے اور اس کے بغیر خواتین کو بااختیار بنانے کا کوئی بھی دعویٰ سچا نہیں ہوسکتا ہے۔

### تعلیمی مساوات

اسی طرح تعلیم میں مساوات یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان برابری بھی ضروری ہے تبھی خواتین کو تعلیم یافتہ بنانے کا خواب حقیقی معنوں میں شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔اس حوالے سے ہمارے ملک نے قدم اٹھائے ہیں اور آزادی کے بعد ہماری سرکاروں کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے خواتین کی تعلیمی شرح میں بہتری آئی ہے اور اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے داخلے کا تناسب پہلے کے مقابلے میں اب کسی حد تک قابل اطمینان ہے۔خواندگی کی مختلف مہموں میں خواتین کی زیادہ شرکت کے نتیجے میں خواندگی کی شرح میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہوتا جارہا ہے۔

آج دنیا بھر میں ابتدائی تعلیمی سطح پر لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کا فاصلہ بڑی حد تک ختم ہوگیا ہے،البتہ چند ممالک ایسے بھی ہیں جہاں یہ برابری تعلیم کی تمام سطحوں پر پائی جاتی ہے۔اسی طرح سیاسی سرگرمیوں میں خواتین کی شمولیت میں بھی مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔جنوری 2014 میں 46 ممالک میں پارلیمنٹ کے کم سے کم ایک چیمبر میں 30 فیصد سے زیادہ ارکان خواتین تھیں، جبکہ دوسری طرف بہت سے ممالک میں صنفی مساوات اب بھی نہیں پائی جاتی اور خواتین کو تعلیم، ملازمت ،معاشی اثاثوں تک رسائی اور حکومتی شعبوں میں امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس وقت دنیا بھر میں 62 ملین لڑکیاں اسکول نہیں جاتیں۔عالمی سطح پر 3 میں سے 1 عورت کو اپنی زندگی میں صنفی بنیاد پر تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ترقی پذیر دنیا میں ہر 7 میں سے 1 لڑکی کی شادی اس کی 15 ویں سالگرہ سے پہلے کردی جاتی ہے،جس میں کچھ دلہنیں 8 یا 9 سال کی ہوتی ہیں۔ہر سال 000,287 سے زیادہ خواتین ،جن میں سے 99 فیصد ترقی پذیر ممالک کی ہوتی ہیں،حمل اور بچے کی پیدائش سے متعلق پیچیدگیوں کی وجہ سے مرجاتی ہیں۔خواتین زرعی لیبر فورس میں 40 فیصد سے زیادہ ہیں، جبکہ صرف 3 سے 20 فیصد خواتین زمیندار ہیں۔ افریقہ میں خواتین کی ملکیت والے ادارے تمام کاروباروں کا 10 فیصد سے بھی کم ہیں،جنوبی ایشیا میں یہ تعداد صرف 3 فیصد ہے اور دنیا کی آدھی آبادی ہونے کے باوجود دنیا بھر کے قانونی اداروں میں خواتین کی نمائندگی محض 20 فیصد ہے۔

ایسے میں خواتین اور لڑکیوں کو مردوں اور لڑکوں کے برابر رکھنا اور انھیں مساوی حقوق دینا ضروری ہے۔صنفی مساوات اور خواتین کی بااختیاری کسی بھی قوم یا ملک کی مجموعی ترقی کا محض ایک حصہ نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی ترقی کی بنیاد اور اس کا مرکزی عنصر ہے،کیوں کہ خواتین کسی بھی قوم کو ترقی یافتہ بنانے اور اسے حصولیابیوں کی راہ پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔وہ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی اور کارگر سرمایہ ہیں جو قومی تعمیر وترقی کے لیے ضروری ہے، اس لیے اگر ہمیں اپنے ملک میں خواتین کا روشن مستقبل دیکھنا ہے، تو انھیں سب سے پہلے تعلیم دینا ضروری ہے۔ بااختیار بنانے یا بااختیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک کمزور پوزیشن سے آگے بڑھ کر طاقت ور اور فیصلہ کن پوزیشن حاصل کرنا،خواتین کو یہ پوزیشن تبھی حاصل ہوسکتی ہے جب ہم ان کی تعلیم پر توجہ دیں اور اس کے لیے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کریں۔ ہر سطح پر خواتین کی تعلیم کی حوصلہ افزائی اور تعلیم کی فراہمی میں صنفی تعصب کو کم کرنے کے لیے خواتین کے لیے مخصوص اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بھی قائم کی جانی چاہئیں۔ کیوں کہ خواتین کی تعلیم ہی صنفی عدم مساوات کو دور کرتی ہے اور خاندان میں ان کی حیثیت کو بہتر بناتی ہے۔اسی طرح اگر خواتین تعلیم یافتہ ہے تبھی وہ حکومت وسیاست کے مختلف شعبوں میں سرگرم حصہ لے سکتی ہے اور اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرکے بھرپور کامیابی حاصل کرسکتی ہے۔گویا خواتین کو بااختیار بنانے کا سب سے کارگر ذریعہ خواتین کی تعلیم کا اہتمام ہے اور خواتین کی تعلیم کے ضمن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان مساوات قائم کرنا ضروری ہے۔لڑکیوں کو ابتدا سے لے کر اعلیٰ سطح تک کی تعلیم بلا کسی تفریق کے دینے کی ضرورت ہے، تبھی انھیں بااختیار بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔

□□□

Dr Md Firoz Alam
Assistant Professor
MANUU,
College of Teacher Education
Darbhanga-846002 (Bihar)
Mob: 9911130633

ڈاکٹر سمیہ ساجد

# زندگی

زندگی اک سیلِ بے کراں
رواں دواں ہے
اپنے ہی انداز میں
دامن میں سمیٹے
ہزاروں غم
ہزارہا خوشیاں
بانٹتی جاتی ہے
بنا کسی امتیاز کے
پھر بھی
کچھ لوگوں کے حصے میں
غم ہی آتے ہیں
اور کچھ کے حصے میں
خوشیاں ہی خوشیاں۔

اس سیلاب کی زد میں
جانے کتنے
کنارے جیسے لوگ آتے ہیں
اور ٹوٹ کر
اس دریا کی
نذر ہو جاتے ہیں۔

پیچھے رہ گئے لوگ
نئے سرے سے
امیدیں بساتے ہیں
خواہشیں اگاتے ہیں
اور پھر بارشوں کا انتظار کرتے ہیں
دعائیں کرتے ہیں
کہ اے خدا
یہ گھٹا جو امڑ رہی ہے
برس جائے
بہالے جائے اپنے ساتھ
یہ حبس زدہ موسم!
مگر یہ گھٹائیں جب برستی ہیں
تو حبس کے ساتھ ساتھ
ہماری خوشیاں اور سپنے بھی
بہالے جاتی ہیں
دنیا کے اُس کنارے تک
جہاں پہنچتے، پہنچتے
عمر کی شام ہو جاتی ہے
اور شام کے بھولے اکثر
گھر لوٹا نہیں کرتے
سو خوشیاں بھی پلٹنا بھول جاتی ہیں۔

**Dr. Sumaiya Sajid**
S - 17\28, Nadesar Cantt.,
Varanasi - 221002 (U.P)
Email: sumaiyasajid2@gmail.com

# غزلیں

سیدہ تبسم منظور ناڈکر

مجھ پہ کیا خوب وہ احسان کیا چاہتا ہے
مجھ سے مجھ کو ہی جو انجان کیا چاہتا ہے

پورا اِس طرح وہ پیمان کیا چاہتا ہے
مجھ پہ جاں اپنی جوقربان کیا چاہتا ہے

ختم انصاف کا اعلان کیا چاہتا ہے
جاری کیا خوب وہ فرمان کیا چاہتا ہے

دے کے تحفۂ غم وآلام ومصائب کے مجھے
میری خوشیوں کے وہ سامان کیا چاہتا ہے

بے وفا لوگو ں سے امیدِ وفا کی خاطر
جی کو کیوں اپنے تو ہلکان کیا چاہتا ہے

سیل وطوفان وحوادث سے گزرجا بے خوف
کام کوئی جو تو ذیشان کیا چاہتا ہے

بے سبب کیوں ہوئی ناراض تبسم اُس سے
وہ تو پورے ترے ارمان کیا چاہتا ہے

سوز اس میں منعکس، مرے قلب وجگر کا تھا
منظر جو میری آہوں میں، رقصِ شرر کا تھا

تیرے سوا کسی سے، عقیدت نہیں رہی
آنکھوں میں میری خواب، ترے سنگِ در کا تھا

راہِ وفا میں، چلتی رہی ہوں تمام عمر
منزل سے کوئی رشتہ، نہ میرے سفر کا تھا

پرتو سے تیرے حسن کے، پُر نور ہو گیا
کتنا حسین رات، سماں میرے گھر کا تھا

کیوں کر گزر نہ جاتے بھلا، حدّ جاں سے ہم
کس کو خیال عشق میں، نفع و ضرر کا تھا

شامل تھا، اِس میں خون مرے دل کا اِس لیے
چرچا گلی گلی، مرے حرف و ہنر کا تھا

مجھ کو ملی نہ اُن سے، تبسم کبھی نجات
رنج و الم سے رشتہ مرا، عمر بھر کا تھا

Syeda Tabassum Manzoor Nadkar
226/1807Road No. 6
Motilal Nagar No. 1
Goregaon-400104 (West) Mumbai

کہانیاں

# سازِ وصل

سیدہ ایمن عبدالستار

زندگی ایک ایسا راستہ ہے جس کی سیڑھی پر بہت دھیان سے پاؤں رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیدھی راہ چلتے چلتے اچانک کوئی موڑ سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن مڑتے ہی آگے ناکامی کی کھائی ہے یا کامیابی کی سیڑھی، اس کا پتہ نہیں چل پاتا۔ یہاں زندگی آپ کو قلابازی بھی کھلا سکتی ہے اور کامیابی کے لڈو بھی، لیکن ایسے موڑ زندگی میں آتے ضرور ہیں۔

اور زندگی میں اچھے دن بھی آتے ہیں اور برے دن بھی۔ خوش بختی اپنا دامن پھیلاتی ہے تو بدبختی بھی چلی آتی ہے، جب ہر چیز الٹ پلٹ ہونے لگتی ہے اور نروس بریک ڈاؤن جیسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی خود کو بے بس سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ آج کی مشکل اور تیز رفتار زندگی میں اس قسم کی باتیں اب غیر معمولی نہیں رہیں اور تقریباً سبھی کو ہی مشکل اور ناپسندیدہ حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جو بندے کو حواس باختہ کر دیتے ہیں، ذہن بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔ اک بے بسی اور لاچاری کی کیفیت ہو جاتی ہے، اپنی صلاحیتوں پر گمان ہونے لگتا ہے۔

ہم میں سے کوئی بھی تو ایسا نہیں ہے جو اپنی زندگی کے آخر تک بغیر دکھ تکالیف اٹھائے سفر کر سکتا ہے اور ہزار جتن کے باوجود اپنی لامحدود خواہشات پوری کر پاتا ہو، کبھی معاشی دکھ گھیر لیتے ہیں، کسی وقت وسائل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی یہ لڑائی کبھی انفرادی طور پر لڑتے ہیں اور کبھی اجتماعی طور پر۔ چھوٹا موٹا دکھ ہو تو اپنی ذات پر لے لیتے ہیں بڑا ہو تو باقیوں کو بھی ساتھ سفر کراتے ہیں پر ہر منزل میں کوئی نہ کوئی کانٹا ضرور چھپا ہوتا ہے۔

تو اب اس کا سدِ باب کیسے کیا جائے، ہنس کر کیا جائے یا رو کر یا واویلا مچا کر کیا جائے۔ اب یہ سب کا انفرادی معاملہ ہے۔ کچھ مہربان مشکل کی ان گھڑیوں کو زندگی کی حقیقت سمجھ کر ایک ٹھوکر سے سائیڈ پر کر دیں گے اور آگے بڑھ جائیں گے۔

اس نے سامان کی تھیلیاں اٹھا کر کچن میں پہنچائی گھر کا دروازہ کھلا تھا برآمدے میں اماں کے ساتھ فریدہ باجی اپنے بچوں سمیت بیٹھی تھی اس نے تھکن سے چور ہونے کے باوجود اتنی سخت دھوپ میں سرخ ہوتے ہوئے بھی ہشاش بشاش چہرہ بنا کر مسکرا فریدہ باجی کو سلام کیا پھر بھی وہ برا سا منہ بنا گئیں۔

اس کا دل ٹوٹ گیا اتنی محنت کے بعد بھی نتیجہ صفر ہی تھا وہ سیدھے روم میں آئی نہا کر نکلی تو چائے چڑھا دی اسے پتہ تھا پھر بھی باجی اسے کوئی طعنہ ضرور دیں گی۔

اب تو اسے ہر ایک کا مزاج عادت اور باتیں اتنی اچھی طرح سے یاد ہو گئیں تھی کہ کیا کرنے پر کیا کہا جائے گا وہ پہلے ہی بتا سکتی تھی اس لیے

اب اس نے اس بارے میں سوچنا ہی بند کر دیا تھا۔
اس کے باوجود بھی وہ "چکنا گھڑا" کہلاتی تھی جس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا اس نے جلدی سے باہر چائے پہنچا دی بچوں کو میگی نوڈلس بنا کر پہنچائے اور خود اپنا کپ لے کر پیر پھیلائے کچن میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئی
وہ جانتی تھی اب فرمائشوں کی لمبی لائن تھی جو اسے بنانا تھا اور اماں کچھ ہی دیر میں چائے کی پیالیوں کو رکھنے کے بہانے کچن میں آنے ہی والی ہوں گی اور اگر وہ اس وقت اسے کمرے میں بستر پر یوں پیر پھیلائے بیٹھی دیکھ لیتی تو ایک ہنگامہ شروع ہو جاتا۔
سبزی مارکیٹ یہاں سے خاصی دور تھی اور آج دھوپ بھی کچھ زیادہ ہی تھی جس سے اس کی طبیعت ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ ٹھنڈے فرش پر یوں بیٹھے چائے پینے میں اسے بہت سکون محسوس ہوا تھا
" رئیسہ....!!! یہاں کیوں پڑی ہو کیا ہوا ...!!" اماں کی تشویشناک آواز سے اس نے آنکھیں کھولی
اماں کے انتظار میں وہ سر کو ٹکائے اونگھنے لگی تھی ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش میں دوپٹہ میں پیر اٹکا اور وہ دوبارہ سے وہیں ایک آواز کے ساتھ پٹخ کر بیٹھ گئی۔
" ارے آرام سے ...!! کیا ہوا...!" اماں نے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو اسے اچنبھا ہوا اماں کبھی اس سے نرمی سے بات نہیں کرتی تھی یہ بھی درست تھا کہ اس سے پہلے وہ تھک کر یوں اونگھنے کچن میں بھی نہیں بیٹھی رئیسہ کے ذہن میں پچھلی دفعہ کا جھگڑا گونجا جب وہ اسی طرح تھک کر آئی تھی اور بیڈ پر سو گئی تھی اللہ کی امان کیا ہنگامہ کیا تھا اماں نے....!!
" میں ٹھیک ہوں اماں...!!" اس نے کہنا چاہا فریدہ بھی پریشان سی نظر آرہی تھی اماں اس کی بات سنی ان سنی کر کے اسے روم میں لے گئی اسے پکڑ کر بیڈ پر لٹایا اس کا ماتھا چیک کیا۔
" تم آرام کر لو شام کے کھانے کو ابھی بہت وقت ہے ...!! آج سادہ ہی بنا لو کل دیکھیں گے کہ کیا بنانا ہے...!" اماں کہہ کر باہر نکلتی چلی گئی آواز میں پھر سے درشتی در آئی تھی فریدہ باجی بھی خاموشی سے چلی گئی۔
اس نے گہرا سکھ کا سانس لیا وہ آج تھک بھی بہت گئی تھی اماں کی مہربانی سے اس کا دل بھر آیا اللہ کسی نہ کسی طریقہ سے اپنی رحمت دکھاتا ضرور ہے جب سے وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تب سے کام کی مشین بنی ہوئی تھی۔
کوئی اس کے کام کی تعریف تو در کنار ایک لفظ شکریہ کا بھی روادار نہیں تھا اس میں اتنی خامیاں نکالی گئی تھی کہ اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی تھی
شادیوں کے لیے" لون" لیا گیا وہ رئیسہ اور حمید کے پیمنٹ سے ماہنامہ قسط کٹائی جاتی سسر کا گھر تو چھ بچوں کی وراثت میں گھل گیا اسے بیچ کر جوان کے حصے میں رقم آئی یہ اسے جوڑ کر گھر کے لیے "لون" لینا پڑا جو مزید کئی سال قسطوں میں کٹنے والا تھا۔
ان کے حصے کے ساتھ اماں آئی تو گھر بھر اپنے ساتھ لائیں تین بیٹیاں دو بہوئیں ہر دوسرے دن ادھر ہی ہوتی تھیں عید برات ان کے پاس ہی ہونے لگی چھٹی کے دن بھی رئیسہ کو آرام نہیں ملتا تھا اس دن سب کو اماں کی یاد ستاتی تھی۔

> ”جب بھی اسے کوئی بات بری لگتی تو وہ سیدھے خدا کے سامنے کھڑی ہوجاتی اسی سے مدد مانگتی اسی کی پناہ میں اپنا سکون تلاش کرتی اللّٰہ سے رشتہ مضبوط کرتی اور پھر اسے سمجھ آگئی کہ زندگی اداسی سے بہت آگے کی چیز ہے جو لوگ چھوڑ جائیں ان کو چھوڑ دینا چاہیے جو توڑ جائیں ان کو معاف کر دینا چاہیے جو الفاظ نہ سمجھ سکے ان کے سامنے خاموشی اختیار کر لینی چاہیے جو جیسا سمجھتا اسے ویسے سمجھنے دینا چاہیے بس جو جہاں ہے اسے وہی رہنے دینا چاہیےکسی کے جانے کا دکھ کرنے کی بجائے صحیح وقت کا انتظار کرنا چاہیے ہر شخص کو راضی کرنا لازم نہیں بس اللّٰہ راضی رہے کافی ہے.....!!!!“

وہ بھولے بسرے کبھی اپنی اکلوتی بہن اور والدہ سے ملنے جاتی تو سارے محلے میں مشہور کیا جاتا کہ گھر پر ٹکتی ہی نہیں اماں الگ مظلوم بنی پھرتی تھی نندوں کی الگ ناراضگی رہتی کہ ایک ہی دن ملتا ہے آنے کو اور وہ نہیں تھی۔
اس کی ہر بات غلط ہر کام بے کار ہر رائے بے مطلب اتنی محنت کے بعد بھی وہ بے وقعت تھی بس مجبوری یہی تھی کہ وہ منہ کھول کر بول نہیں سکتی تھی کسی سے لڑ نہیں سکتی تھی اپنے لیے تنہا کھڑے ہونا اس کے لیے مشکل تھا
جب بھی اسے کوئی بات بری لگتی تو وہ سیدھے خدا کے سامنے کھڑی ہوجاتی اسی سے مدد مانگتی اسی کی پناہ میں اپنا سکون تلاش کرتی اللہ سے رشتہ مضبوط کرتی اور پھر اسے سمجھ آگئی کہ زندگی اداسی سے بہت آگے کی چیز ہے

جولوگ چھوڑ جائیں ان کو چھوڑ دینا چاہیے جو توڑ جائیں ان کو معاف کر دینا چاہیے جو الفاظ نہ سمجھ سکے ان کے سامنے خاموشی اختیار کر لینی چاہیے جو جیسا سمجھتا اسے ویسے سمجھنے دینا چاہیے بس جو جہاں ہے اسے وہی رہنے دینا چاہیے کسی کے جانے کا دکھ کرنے کی بجائے صحیح وقت کا انتظار کرنا چاہیے ہر شخص کو راضی کرنا لازم نہیں بس اللہ راضی رہے کافی ہے...!!!!

" آج کل کی خواتین نے شوہر نہیں شوہر نام کا پالتو جانور پال رکھا ہے۔

"مائے جانو بے بی...!!

میرا بے بی...!!

جانو مجھے آج شوپنگ کرنی تھی جانو آج مجھے پارلر چھوڑ دو بے بی مجھے۔

آج فلم دیکھنے جانا ہے بے بی...!!"

مجھے کھانا بنانا نہیں آتا جانو.....!!"

آج برتن آپ دھولو.....!!"

شوہر نہ ہوا ملازم ہے ہر فن مولا ہے فیشنیبل خواتین کا پرس ہے ،کریڈیٹ کارڈ ہے....!!

"آج کل تو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا ایسی لڑکی ...!! ادھر نکاح کے دو بول پڑھے نہیں ادھر نئی نویلی دلہن میرا گھر میرا شوہر ہم دو ہمارے دو کا پہاڑہ شوہر کو رٹوادیتی ہیں .....!!!!ان کا شوہر بس ان کا ہے نہ اس کے والدین ہیں نہ ہی بھائی بہن اور نہ ہی دوسری کوئی ذمہ داری ہے..!!" ایک خاتون تاسف سے سر ہلا کر بولی تو پہلی خاتون کا چہرہ مرجھا گیا۔"

لعنت ہے ایسے مردوں پر جو صنف نازک کی ساری کے پلو کو گلے میں باندھے بے دام غلام بنے پھرتے ہیں....!!!

ان میں آجکل کے ٹی وی سیریلز اور فحش قسم کے ناولز کا بھی رول ہے کنواری لڑکی کا ذہن رومانس سے آگے جاتا ہی نہیں وہ کسی بھی ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں....!!!

ان میں ماؤں کی غلطی بھی ہے....!!" آجکل کے گھریلو حالات پر تبصرے کرتے ہوئے لڑکے لڑکیوں سے ہٹ کر اب اس بڑی بی کا رخ والدین کی طرف مڑ گیا تھا۔

" آجکل کی مائیں خود موبائل واٹس ایپ فیس بک پر دن رات مشغول ہیں تو اولاد کی بہترین تربیت کون کرے اگر ہم ہماری نسلوں کی باتیں بتائیں تو دقیانوسی خیالات، ذمہ داری کا احساس دلائیں تو مصیبت بلا اور نوڈسٹرب کا بورڈ لگا دیتے ہیں....!!!

حد ہے....!!" بڑی بی کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا میلاد کی محفل میں بیٹھی جوان خواتین ایک طرف کو کھسک گئی تھی اب ساس قسم کے خواتین اپنی بہوؤں کی شکایتوں کا پٹارا کھولنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

" میرے چار بیٹے ہیں ...!! تین سے تو فارغ ہوگئی ہوں بس ایک رہ گیا ہے ابھی سے تینوں بہوئیں گھر میں میرے کام کے لیے ایک دوسرے سے جھگڑتی ہیں جانے اب چوتھی کیسی آئے گی....!!وہ میرا تھوڑا خیال کرے گی یا وہ بھی ان جیسی نکلے گی....!!!اب وہی آخری امید ہے اللہ میرے نصیب اچھے کرے....!!" ایک خاتون آنکھیں نم کیے بول رہی تھی۔

" ہاں اب وہ زمانہ گیا جب لڑکیوں کی نصیب کی دعائیں دی جاتی تھیں اب تو ہم جیسوں کو ان دعاؤں کی ضرورت ہے بہن....!!" بڑی بی نے تلخی سے کہا اور ہونٹ تیزی سے ہلنے لگے تسبیح کے دانے اسی رفتار سے سرکنے لگے۔

" ویسے آپ کو کیسی لڑکی درکار ہے...!!" اچانک کسی کا پریشان پسینے میں شرابور چہرہ نگاہوں میں گھوما تو بڑی بی نے جلدی سے پوچھا۔

" لڑکی نرم گو سیدھی سادھی عزت واحترام کرنے والی ہو بس..!!"

خاتون مسکرا کر بولی ان کے چہرے سے شفقت جھلک رہی تھی۔

" آج کل تو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا ایسی لڑکی...!! ادھر نکاح کے دو بول پڑھے نہیں ادھر نئی نویلی دلہن میرا گھر میرا شوہر ہم دو ہمارے دو کا پہاڑہ شوہر کو رٹوا دیتی ہیں....!!! ان کا شوہر بس ان کا ہے نہ اس کے والدین ہیں نہ ہی بھائی بہن اور نہ ہی دوسری کوئی ذمہ داری ہے..!!" ایک خاتون تاسف سے سر ہلا کر بولی تو پہلی خاتون کا چہرہ مرجھا گیا۔"

انھیں باتوں سے ان کے تینوں بیٹے الگ ہو گئے تھے ایک کے بعد ایک شادیاں انھوں نے کیسے نپٹائی تھی یہ تو وہ اور ان کے خاوند جانتے تھے یا تو اللہ کی ذات کو پتہ تھا

" لڑکیوں میں برداشت صبر تحمل خاموشی رہی ہی نہیں ہے....!!"

بڑی بی شہادت کی انگلی ٹھنڈی پر ٹکاتی حیرت کا اظہار کرنے لگی۔

" ہم اپنی بچیوں کو تعلیم وتربیت کے ساتھ یہ نہیں بتاتے کہ انھیں

سسرال میں کون سی ذمہ داری اور فرائض انجام دینے ہیں ہم یہ تو بتاتے ہیں کہ شوہر کا کتنا حق ہے...!!! یہ کوئی بتانے کو تیار نہیں کہ شوہر کے والدین کا بھی تو اپنے بیٹے پر کچھ حق ہے....!!

مائیں اپنے ظلم و ستم کی سچی جھوٹی کہانیاں سناتی ہیں اور لڑکیاں شادی کے بعد صرف رومانس اور الگ رہنے تک محدود کر لیتی ہیں گھر سنسار کرنا کوئی کھیل تھوڑی ہے بڑی مہارت لگتی ہے چالیس چالیس پچاس پچاس سال جو گھر تنکا تنکا کر کے جوڑتی ہیں وہ یہ تیلیاں گھر میں گھستے ہی بکھیر کے رکھ دیتی ہیں...!!!" بڑی بی کا پارہ ٹھنڈا ہوا تو ایک خاتون نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"یہ گھر گھر کی کہانی ہے اس سے کون بچ سکا ہے بھلا....!!" پہلی خاتون مایوسی سے بولی

"الحمدللہ..!! اللہ کی ایک نعمت ایسی ہی ہے میرے پاس شادی کو اٹھارہ سال ہو گئے ہیں مگر مجال ہے جو پلٹ کر جواب بھی دے.....!! میں اسی کی بہن کی بات کر رہی ہوں۔ بچی یتیم ہے آپ ذرا پیار سے سنبھال لیں گی تو آپ کی بھی خدمت کرے گی دونوں بہنیں ایک جیسی ہی ہیں کیوں نہ ہو ایک ماں کی اولاد ایک تربیت ہے اگر آپ ٹرائی کرنا چاہیے تو یہ پتہ نوٹ کریں بچی اپنے بھائیوں کے گھر باری باری رہتی ہے....!!" بڑی بی پہلی خاتون کو پتہ لکھوانے لگی۔

"تمھاری بات پر تمھاری سچی زبان پر میں اس گھر کی چوکھٹ پر جاؤں گی بہن.....!! ورنہ تو آجکل کلیوگ ہے کوئی کسی کا نہیں اپنی سگی اولاد بھی نہیں تو یہ یتیم میری کیا بنے گی...!!" پہلی خاتون صورتحال سے مایوس ہو گئی تھی تسلی بخش جواب نہ دے پائیں۔

"اللہ کی ذات پر اور اس کے بعد میری زبان پر بھروسہ کر کے ایک نظر بچی کو دیکھ تو لو...!!! جوڑیاں تو اللہ بناتا ہے جی ہمارا کام تو تلاش کرنا ہے...!! کس کا ملنا کسی کا بچھڑنا سب کا سب وہی طے کرتا ہے...!!" بڑی بی نے لگاوٹ سے کہا تو پہلی خاتون کسی سوچ میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"میرے سامنے تو تم ہو رئیسہ...!!" فریدہ باجی کی بات پر اس نے حیرت سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ان کے گلے میں ایک لاکٹ اور کھنٹھن پڑا تھا یعنی چار تولے تو ایسے ہی گھر میں پہنے رہتی تھی سونے کی ہلکی چوڑیوں کا الگ حساب تھا ناک میں ہیرے کی لونگ تھی جو بھائی جان پردیس سے لائے تھے اور کان میں پڑے وائٹ گولڈ کے بندے ان کی قیمت کا سوچ کر ہی رئیسہ کو پورے سال کا خرچ یاد آتا تھا۔

فریدہ باجی اس کی نند تھی اس کے شوہر فیروز سے چھوٹی تھی لیکن اس سے عمر میں دو تین سال بڑی تھیں رئیسہ کو اپنی نند سے بہت خوف آتا تھا ان کی ایکسرے مشین کی طرح آنکھیں خاموشی میں بھی جیسے سب کچھ جان لیتی تھی۔

"عبدالجلیل مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور کیوں نہ ہو وہ میرا بھتیجہ ہے گھر کا پہلا بچہ جس نے میرے ان ہاتھوں میں آنکھیں کھولیں پل بڑھ کر جوان ہوا یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسے کوئی بڑی جاب نہیں ملی ...!!" فریدہ باجی نے گیٹ کے پاس ٹہلتے عبدالجلیل کو دیکھا جو بے چینی سے موبائل کان سے لگائے کسی سے بات بھی کر رہا تھا یا محض دکھاوا کر رہا تھا رئیسہ سمجھ نہیں سکی۔

وہ یہاں اس وقت عبدالجلیل کی وجہ سے تو فریدہ باجی کے سامنے بیٹھی تھی فریدہ باجی کی بڑی بیٹی ثروت سے عبدالجلیل کو جانے کب محبت ہو گئی تھی کہ وہ تو اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے یہ بھی جان نہ سکی کہ ثروت بھی اپنے من مندر میں اسے سجا کے بیٹھی ہے۔

جانے کتنے دنوں کے انتظار کے بعد وہ آج فریدہ باجی کے سامنے یہ بات کہنے کی ہمت کر پائی تھی اسے یقین تھا فریدہ باجی اس کی بات رد ضرور کریں گی وہ اس سے بے حد چڑتی تھی رئیسہ کے خیال سے وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔

وہ تو عبدالجلیل اور ثروت کے لیے پریشان تھی اسی لمحے ملازمہ لوازمات سے بھری ٹرے اٹھا لائی فریدہ باجی اس کے سامنے ایک ایک چیز اٹھا کر رکھنے لگی رئیسہ کی روح تو سماعت میں جا سمائی تھی کہ جانے فریدہ باجی کیا کہنے والی تھی

"شاید یہ بات تمھیں معلوم ہو...!! ابھی پچھلے ہی دنوں منجھلی اپنے عبدالسلام کے لیے ثروت کو مانگ چکی ہے اس کی سروس ہے باہر جانے کے سارے راستے کھلے ہیں بلکہ اس کی تو عبدالجلیل سے عمدہ جاب ہے لیکن میں نے منجھلی کو منع کر دیا....!!!" فریدہ باجی چائے کا کپ لبوں سے لگاتی ہوئی بولی ان کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی وہ بہت پر سکون تھی۔

رئیسہ جانتی تھی فریدہ باجی اب سہولت سے اسے منع کر دیں گی وہ تو اسی پر مالک کی شکر گزار تھی کہ فریدہ باجی نے سخت و سست نہیں سنایا ورنہ خواہ مخواہ بچوں میں بھی اندیکھی جنگ شروع ہو جاتی۔

اماں کے جانے کے بعد اچانک ہی سہی فریدہ باجی میں بہت بدلاؤ ٹھہراؤ سا آ گیا تھا وہ رئیسہ سے کافی عزت اور وقار سے بات کرنے لگی تھی ورنہ تو ان کے طعنوں سے پہلے رئیسہ بہت افسردہ اور پریشان رہتی تھی۔

اور منجھلی اور عبدالسلام بھی ان کی بھاوج تھی اور وہ یہ بات جانتی بھی

تھی منجھلی نے فریدہ باجی کے پیچھے انھیں خوب کھری کھوٹی سنائی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ عبدالسلام کو ان سے بڑے اور اونچے گھرانے کی لڑکی کر کے لائیں گی اور انھیں بتائیں گی۔

" لیکن یہاں میرے سامنے تم ہو رئیسہ...!!" یہ کلمہ دوبارہ کہا گیا تو وہ کچھ ٹھٹھک کر فریدہ باجی کو دیکھنے لگی وہ اس جملے کا مطلب نہیں سمجھ پا رہی تھی فریدہ نے اس کی آنکھوں کی حیرت پڑھ لی۔

" تمھیں یاد ہوگا جب بھی میں آصف سے جھگڑا کر کے آتی تھی مجھے یقین ہوتا تھا وہاں تم ہو جو میری بدزبانی کے باوجود میرے آرام کا پورا خیال رکھو گی تم نے صرف اماں کو نہیں سنبھالا رئیسہ....!!" رئیسہ نے حیران ہو کر فریدہ باجی کو دیکھا

" لوگ کہتے ہیں میں بھی کہتی تھی کہ صرف ایک آدمی بھاری ہے ....!!!لیکن رئیسہ تم صرف اماں کو نہیں سنبھال رہی تھی کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ تم اماں کے پیچھے کھڑی اماں کی تمام ذمہ داریاں نبھا رہی ہو ہم چار بہن بھائیوں کی شادیوں میں جو تم نے اپنی کمائی اپنی جسمانی محنت اور ایک ایک چیز دے کر کی ہے اس کا اجر اس دنیا میں کوئی نہیں دے سکتا رئیسہ....!!!"

فریدہ باجی کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو برسوں سے رکا سیلاب اس کے حلق میں کہیں اٹک سا گیا آنکھوں سے گرم پانی قطرہ در قطرہ بوند بوند جڑا بہنے لگا۔

" میرے سامنے تو تم ہو رئیسہ...!!! جب بھی میں بال بچوں کے ساتھ آتی تو تم سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے لیے تیار کھڑی ملتی تھی میری خدمتیں بھاگ بھاگ کر کرتی میں اماں کو تمھارے خلاف بھڑکاتی تو تم چپ رہتی....!!!

" دراصل میں تم سے حسد کرتی تھی کہ کوئی اتنا اچھا اتنا صابر کیسے ہو سکتا ہے ہر دفعہ تمھارے صبر کو آزماتی تمھیں شاید یاد ہو کہ عبدالجلیل کے بعد تمھیں کوئی اولاد سال در سال نہیں ہوئی تو وہ میں ہی تھی جس نے دوسری شادی کا خیال اماں کے ذہن میں بھرا....!!" آج جیسے حساب کا دن تھا جانے اب اور کون سے نئے انکشافات کرنے والی تھی

کسی کی سنی سنائی سی بات اس کی سماعت سے الجھنے لگی۔

اگر کبھی زندگی میں ایسی تکلیفوں سے گزرو جن کا کبھی گمان بھی نہ کیا ہو تو اطمینان رکھنا کہ اللہ تمھیں راحتیں بھی ایسی ہی عطا کرے گا جن کا کبھی خیال بھی دل میں نہیں گزرا ہوگا ایک وقت ان شاء اللہ ایسا بھی ضرور آئے گا جب تم ان دکھوں اور مشکلوں کو سوچ کر مسکرا دو گے جن کی وجہ سے آج پوری پوری رات روتے ہو۔اپنے رب پر یقین رکھیں وہ آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا....

کچھ پھول دھوپ میں کھلتے ہیں اور کچھ چھاؤں میں اسی لیے اللہ بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کب بہتر ہے اور وہ ہمیں وہی دیتا ہے جو ہمارے لیے بہتر ہے.....!!!بس یقین پکا ہونا چاہیے۔

یقین....!!!

" آہستہ آہستہ سب بھائی الگ ہو گئے تو مجھے سمجھ آئی کہ مجھے سمجھنے والی تو صرف تم تھی جو اس کے بعد بھی میرا مسکرا کر استقبال کرتی تھی صرف دھن دولت اقتدار رتبہ روپیہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا عمر ڈھلنے لگی تو اپنے اور پرائے کی خودغرضی اور مطلبی لوگوں کی پرکھ ہونے لگی اماں گزر گئیں پھر بھی مجھے یتیمی کا احساس نہیں ہوا جانتی ہو کیوں....؟؟" وہ سوال بنی پوچھ رہی تھی وہ نم ہوتی آنکھیں صاف کر کے انھیں دیکھ نفی میں سر ہلانے لگی۔

" کیونکہ میرے سامنے میری دوسری ماں بنی ہمیشہ سے تم تھی رئیسہ...!!عمر میں مجھ سے چھوٹی کمزور اور بے بس ہوتے ہوئے بھی تم کب میری ماں بن گئی مجھے خبر نہ ہوئی آج بھی میرے دل میں یہ بھروسہ ہے کہ یہاں گھر میں کچھ بھی ہو جائے تو تم ہو میرے پاس میری ماں بن کے ...!!" فریدہ باجی نے اس کا ٹھنڈا ہوتا ہاتھ اپنے دونوں گرم ہاتھوں میں لے لیا۔

رئیسہ اکثر یہی سوچتی تھی کہ...!!!
یہ بات کوئی نہیں جانتا۔۔!!
کہ
تمھارے ساتھ کیا گزری۔
حالات کے ساتھ تمھاری جنگ کیسی رہی
تم زندگی سے کتنا لڑے
کتنی بار ناکام ہوئے
کتنی خوشی ملی
تمھاری انا کی موت
مشقتیں
نقصانات
تمھارے علاوہ کوئی نہیں سمجھے گا۔
مطمئن رہو
ذہن کو پرسکون رکھو

فریدہ باجی کی آواز نے اسے خیالوں سے نکلنے پر مجبور کیا

" تمھارے اس طویل صبر اور خاموشی نے نہ جانے کن کن کا دل جیتا ہے آج خاندان بھر میں تم ایک معزز اور ممتاز خاتون ہو جن کی مثالیں

دی جاتی ہیں میں بھی ثروت کی ماں ہوں رئیسہ.....!!!!ایک ماں اپنے کلیجہ کے ٹکڑے کو کیسے جدا کرتی ہے یہ وہی جانتی ہے....!!اور میں اپنے دل و آنکھوں کے نور کو تمھارے حوالے کر کے مطمئن ہو جاؤں گی کہ.....!!

" کہ مجھے یقین ہے تم میری ثروت کو سنبھالو گی وہ بچپنہ کر کے کوئی غلطی کوتاہی اگر کر بھی دے گی تو تم اسے سنبھال لو گی اسے کسی غلط راہ پر جانے سے روک لو گی تم نے ساری زندگی زبان سے کسی کی دل آزاری تک نہ کی ہو میری ثروت کو کیسے کوئی تکلیف دو گی اور کیسے تمھاری گود میں پلا بچہ کسی طرح کی کوتاہی کرے گا....!!!" فریدہ باجی اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور رئیسہ کا سر بے اختیار ہی ان کے سینے سے جا لگا آنکھیں تھیں کہ برسی جا رہی تھیں سسکیاں تھیں کہ مچل مچل کر ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔

" تم نے تنہا ہی ایک پر خار راستے کو طے کیا ہے کڑی دھوپ کی جلن برداشت کرتے کرتے خود جھلس گئی لیکن خونی رشتوں پر آنچ نہ آنے دی رئیسہ میرے سامنے تم ہو جس کی میں بات ٹالنا بھی گناہ سمجھتی ہوں....!! تم اسے میری خودغرضی سمجھو یا کچھ بھی میں تو اپنی زندگی ہر رشتے سے تمھارے ساتھ تمھارے سہارے کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں رئیسہ ...!!" فریدہ باجی خاموشی سے اس کے بہتے آنسو صاف کرنے لگی جانے کب سے عبدالجلیل اور اس کے ابو ان کے پیچھے آ کھڑے ہو گئے تھے ساری باتیں سن کر ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا

رئیسہ خاموشی اور صبر کا دامن تھام کر ایسا چلی کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ کیا کیا گزر چکا ہے اس کی جوانی، محنت، خدمت، وقت، روپیہ، پیسہ ہر چیز.....!!!

وہ جانتی تھی اگر وہ یہ سب نہ کرتی تو اللہ کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ اس کی جگہ بدل چکی ہوتی وہ جو چاہتا وہ کسی اور کے تقدیر سے بھی کرواتا ہے وہ پھر سے شکر گزار ہو گئی کہ اللہ نے اسے چنا تھا ان سب خدمتوں کے لیے اگر وہ صبر و تکس س کے انجام تک نہ پہنچ چکی ہوتی تو کوئی دوسرا اس کی جگہ ہوتا۔

شادی کی تیاریاں زور پکڑنے لگی جب رشتہ فائنل ہو رہا تھا تو باہر کھڑی ثروت کے دل میں ہلکی ہلکی ترنم میں ڈوبی وصل کی گھنٹیاں بجنے لگیں تھی فریدہ باجی نے بڑے دھوم سے دھام سے شادی کی تھی سارے خاندان والے حیران تھے یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی منجھلی بھابھی تو اتنی کڑوی ہو گئی تھی کہ رئیسہ کے ساتھ ثروت سے بھی سیدھے منھ بات نہیں کرتی رئیسہ کے ساتھ کسی کو بھی زیادہ ان کی پرواہ نہیں تھی۔

رئیسہ کو انیسہ اور اماں کی اچانک آمد نے خوش کر دیا وہ بھی اپنے اکلوتے نواسے اور بھانجے کی شادی انجوائے کرنے آئی تھی۔ انیسہ کو اچانک ہی آصف کا رشتہ آ گیا اور چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا انیسہ کی ساس اکثر اس سے ملتی تھی جب بھی وہ انیسہ کی خدمت کی تعریف کرتی تو رئیسہ کا دل سکون سے اور آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھر جاتی تھی اماں کا بہت بڑا بوجھ بہت آسانی سے ہلکا ہو گیا تھا۔

اور اس آسانی میں اس کی ساس کا ہاتھ تھا انھوں نے ہی بڑے یقین سے آصف کی ماں کو ان کی چوکھٹ پر بھیجا تھا۔ آج انیسہ کو اپنے چار بچوں کے ساتھ خوش باش دیکھ کر اسے اماں بے اختیار یاد آئی تھی۔

جیسے اللہ رب العزت نے دن کے اجالوں کے ڈھلنے کا وقت مقرر کر رکھا ہے ویسے ہی اس نے رات کے اندھیروں کا اختتام بھی لکھ رکھا ہے....کبھی کبھار ایسا ضرور لگتا ہے کہ اب ہم اس درد سے باہر نہیں نکل پائیں گے لیکن اللہ رب العزت ہمیشہ ہمارے لیے کہیں نا کہیں سے راستے بنا ہی دیتا ہے وہ کسی نا کسی طرح سے ہمیں درد سے نکال ہی لیتا ہے اور یہی تو اس کا وعدہ ہے کہ:

"عنقریب تمہارا رب تمھیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے"

جب حالات بدتر سے بھی بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں تب معجزے ہوتے ہیں اور دعاؤں کے جواب دے کر دل مطمئن کر دیئے جاتے ہیں...جیسے اللہ رب العزت نے اس آیت مبارکہ میں تم سے فرمایا ہے کہ میں تمھیں خوش کر دوں گا، تمھیں راضی کر دوں گا، یعنی تمھیں وہی دوں گا جو تمھیں پسند ہے اور اتنا دوں گا کہ پھر کبھی بھی اس کی طلب تمھیں غمزدہ نہیں کرے گی.....!

وہ معجزوں کے راستے وہاں سے بناتا ہے جہاں تمھاری دعائیں بھی نہیں جا سکتیں، وہ اپنی مدد اپنے پوشیدہ ترین ذریعوں سے بھیجتا ہے، وہ ذریعے جن کے بارے میں کوئی بھی کچھ بھی نہیں جانتا....اس کی ذہانت وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں بڑی بڑی عقلوں والے بھی نہیں جا سکتے.... جہاں مقدر کے فیصلے تمھارے مخالف ہونے لگتے ہیں۔ اللہ رب العزت وہاں تمھارے لیے دعاؤں کی گنجائش نکال دیتا ہے...!!!!!!

Syeda Aiman Abdus Sattar
D/o. S.A.Sattar
Government Contractor
Balaji Mandir Road
Near Basweshver College Hamal Galli
Latur-413512 (M.S)

نیلوفر سعدیہ

# قصہ تیرے نام کا

دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ بیڈ پر بیٹھا بے حد پریشان لگ رہا تھا ڈرائنگ روم سے آتی ہوئی بحث بازی کی آوازیں اس کا سر درد مزید بڑھانے لگیں اور اگلے ہی لمحے اس کے کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا وہ اُٹھ کھڑا ہوا کیونکہ سامنے اُس کے ابو شعیب خان کھڑے تھے جو کہ بے انتہا غصے میں اسے ہی دیکھ رہے تھے۔شعیب خان کے پیچھے اُن کی امی وران کی بیگم تنزیلہ انھیں روکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔

شعیب خان کا چہرہ شدید غصے سے سرخ ہو رہا تھا اوران کا غصہ دیکھ کر تنزیلہ اور شعیب خان کی امی رقیہ بیگم بے حد ڈر رہی تھیں۔

"شعیب بیٹا۔ نا سمجھ ہے وہ ابھی بچہ ہے میں بات کروں گی عارض سے وہ مان جائے گا۔" امی کی بات کو نظر انداز کر کے وہ عارض کے قریب آ کر رکے۔

"کیا کہا تم نے اپنی امی اور دادی جان سے۔ پھر سے کہو۔"

عارض سنجیدگی سے اپنے ابو کو دیکھتے ہوئے بولا۔"مجھے آپ کے دوست کی بیٹی سے شادی نہیں کرنی ابو۔ میں کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بے خوف ہو کر بولا تو شعیب خان نے بھڑک کر اس پر ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ رقیہ بیگم نے ان کے ہاتھ کو روک کر کہا۔

"جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھانا اچھی بات نہیں شعیب ہم اسے سمجھالیں گے بیٹا۔"

"آپ کے اس لاڑ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے امی۔اسے کسی چیز کی کمی دی ہم نے ایک لوتی اولاد ہونے کے سبب ہم نے اس کی ہر خواہش پوری کی اور یہ ہے کہ اپنے ابو کی ایک بات مان نہیں سکتا۔"

"ابو آپ مجھ سے کچھ بھی مانگ لیں ،مگر میرے ساتھ زبردستی کسی کو مت باندھیں ،پلیز ابو۔"

"اپنا منہ بند کرو بد بخت۔۔ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔تمھاری شادی میرے دوست سہیل احمد کی بیٹی عنایہ سے ہی ہوگی۔سمجھ گئے ہو تو بہتر ہے ورنہ اپنی بات زبردستی منوانا جانتا ہوں میں۔" اتنا کہہ کر وہ رکے نہیں کمرے سے باہر چلے گئے۔

عارض پریشان ہو کر بولا۔

"امی آپ ابو کو سمجھاتیں کیوں نہیں۔دادی جان آپ تو میرا ساتھ دیں میری زندگی برباد ہو جائے گی اس لڑکی سے شادی کر کے جسے میں نے نہ دیکھا ہے نہ جانا ہے۔"

"عنایہ بہت پیاری لڑکی ہے عارض تم ایک دفعہ اس کی تصویر دیکھ تو لو۔"

"مجھے اس کی کوئی تصویر نہیں دیکھنی امی مجھے اشمیرا سے شادی کرنی

ہے۔"

"عارض تم جس لڑکی کی بات کر رہے ہو اس کے نام کے علاوہ تم اس کے بارے میں جانتے ہی کیا ہو۔ بس اسے ایک شاپنگ مال میں دیکھا اور نہ جانے کیسے اس کا نام معلوم کیا اور کہتے ہو کہ شادی کرنی ہے اسی سے۔"

"امی اشمیرا کے ساتھ کوئی عورت تھی جو اسے اس نام سے پکار رہی تھی۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گا امی اس کا پتہ تلاش کر کے رہوں گا۔ آپ اس کے گھر رشتہ لے جائیں پلیز امی۔ مجھے اسی دن اس کا پتہ مل جاتا لیکن وہ میری نظروں سے گم ہو گئی سارے مال میں ڈھونڈا اسے وہ کہیں نہیں ملی۔ وہ آپ کو اس عنایہ سے زیادہ پسند آئے گی امی۔" اس کا انداز گڑگڑانے والا تھا۔

"عارض ۔میرا بچہ ایسے دل چھوٹا نہ کر۔ اگر اشمیرا سے محبت کرتے ہو تو وہ ضرور ملے گی۔ البتہ اپنے ابو کا دل رکھنے کے لیے ہی صحیح عنایہ کی تصویر ایک بار دیکھ تو لو اتنی پیاری لڑکی ہے ۔بیٹا میں مل چکی ہوں اس سے اگر دیکھنے کے بعد بھی پسند نہ آئے تو تیرے ابو کو اشمیرا کے لیے مناؤں گی۔"

"بس ایک بار میں ہی تم اسے اتنا جان گئے۔ وہ کیسی ہے کیا کرتی ہے اس کی فیملی کیسی ہے کچھ جانتے ہو؟"

"نہیں امی نہیں جانتا پر سب پتہ کروں گا اس کے بعد تو آپ لوگ جائیں گے نا رشتہ لے کر۔"

"ایک آخری بار تمھارے ابو سے بات کروں گی اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی میں۔" وہ رنجیدگی سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کی دادی جان اسے محبت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"عارض۔ میرا بچہ ایسے دل چھوٹا نہ کر۔ اگر اشمیرا سے محبت کرتے ہو تو وہ ضرور ملے گی۔ البتہ اپنے ابو کا دل رکھنے کے لیے ہی صحیح عنایہ کی تصویر ایک بار دیکھ تو لو اتنی پیاری لڑکی ہے۔ بیٹا میں مل چکی ہوں اس سے اگر دیکھنے کے بعد بھی پسند نہ آئے تو تیرے ابو کو اشمیرا کے لیے مناؤں گی۔"

وہ محبت سے عارض کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی تو عارض نے ان کا وہی ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

"دادی جان اشمیرا کو دیکھنے کے بعد میں اور کسی کو نہیں دیکھ سکتا مجھے معاف کر دیں میں عنایہ کی تصویر نہیں دیکھ سکتا۔"

رقیہ بیگم اس کے چہرے کو دیکھ کر پگھل رہی تھیں۔ ایک لوتے بیٹے کی ایک لوتی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ اس سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ اور وہ بھی اپنی دادی جان اور امی ابو سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے امیر ماں باپ کی بگڑی اولاد نہیں تھا اُس کے والدین نے اس کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی جو اس نے شعیب خان کی نہ مانی ہو۔ آج پہلی دفعہ اس نے اپنے ابو کی کسی بات سے انکار کیا کیونکہ اسے اشمیرا سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اس محبت کے جال سے باہر نہیں آسکتا تھا۔

آج موسم انتہائی خوشگوار تھا کھلا آسمان، تازی ہوا، پھر بھی وہ آج اپنے کمرے میں لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ پھوپو زاد بھائی اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اسے ایسے بیڈ پر لیٹا ہوا دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا دیوداس بنے بیٹھے ہو۔ کیا ہوا تمھیں؟" عارض چپ سا لیٹا ہوا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عارض کدھر گم ہو گئے ہو۔ اب کیا نظروں سے چھت گراؤ گے۔
وہ مزاحیہ انداز میں بولا تو عارض نے کہا۔

"چپ ہو جاؤ حمزہ میرا موڈ بہت خراب ہے۔" وہ غصہ ضبط کر کے دوٹوک بولا مگر اس کی بات کو نظرانداز کر کے حمزہ نے کہا۔ "چلو بھائی اٹھو اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے باہر گھومنے چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "نا میرا موڈ خراب ہے تم جاؤ۔"

"میں تو اکیلے جانے سے رہا۔ اب مجھے یہ بتاؤ تمھیں کیا ہوا ہے۔" عارض نے کوئی جواب نہیں دیا حمزہ نے بار بار پوچھا عارض نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ پر حمزہ نے بھی ہار نہ مانی آخر کو عارض نے اسے سب بتا دیا تب جا کر حمزہ کو اس کی اُداسی کی وجہ معلوم ہوئی۔

"دیکھو میرے بھائی اگر وہ لڑکی تمھارے نصیب میں خدا نے لکھ دی ہے تو وہ کہیں سے بھی تمھیں مل کر رہے گی البتہ اللہ نے عنایہ کو تیرے لیے بنایا ہوگا تو وہی تیری ہم سفر بنے گی اسے تیری منکوحہ بننے سے پھر دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

عارض خاموش رہا۔ پھر کچھ دیر بعد کہا۔ "میں نے اسے پورے شہر بھر میں ڈھونڈا حمزہ، وہ مجھے کہیں نہیں ملی امی نے بھی مجھ سے کہہ دیا ہے کہ وہ لڑکی ملی ہی نہیں تو اس کے گھر رشتہ کیسے لے جائیں؟" حمزہ نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"صبر رکھو عارض سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے اسے ڈھونڈا وہ

نہیں ملی۔تم نے اپنا کام کیا اپنی جانب سے ہر کوشش کی اب اللہ پر سب چھوڑ دو جو ہو رہا ہے وہ ہونے دو۔اللہ نے تمھارے حق میں ضرور سب سے بہترین فیصلہ لیا ہوگا۔"

عارض نے اثبات میں سر ہلایا۔اشمیرا کے خیالات سے باہر نکلنے میں اسے وقت چاہیے تھا۔

"میں نے تو اشمیرا کو اپنی دلہن مان لیا تھا۔" وہ رک گیا اور گہری سانس لی۔حمزہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

"مجھے بہت وقت لگے گا حمزہ اس کے خیالات سے ابھرنا مجھے بہت دشوار لگ رہا ہے بھائی۔"

میری بات مانو تو ایک بار عنایہ کی تصویر دیکھ لو۔" عارض نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں حمزہ میرا قطعاً دل نہیں کر رہا تصویر دیکھنے کا۔"

"ٹھیک ہے جب دیکھنے کا دل ہو تب دیکھ لینا۔وہ اس کی کمر تھپتھپا کر وہاں سے چلا گیا۔"

عارض کی شادی کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔گھر بھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔شعیب خان کی خوشی کی انتہا نہ تھی کہ ان کے بیٹے نے عنایہ سے شادی کے لیے ہاں کہہ دیا ہے۔عارض نے اپنی امی ابو کی خوشی کی لیے اپنی محبت قربان کر دی۔مگر وہ اندر سے خوش نہیں تھا۔ظاہری طور پر مہمانوں کو اور اپنے والدین کو دکھانے کے لیے وہ مسکرا رہا تھا پر دل کا حال تو رب ہی جانتا تھا۔

آخر کو شادی کا دن آ گیا اور عارض ،عنایہ نکاح کے پیارے رشتے میں بندھ گئے۔

جب دلہن کو گھر لایا گیا تب عارض ذہنی تناؤ کے سبب تنہا چھت پر چلا گیا اور دیر رات تک وہیں بیٹھا رہا۔اس کی امی نے اُسے بلا کر کمرے میں جانے کے لیے کہا کمرے کی جانب بڑھتے قدم اُسے بھاری محسوس ہونے لگے۔اس نے دروازہ کھولا کمرے میں داخل ہوا کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ مڑا تو اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔وہ دم بخود سا کھڑا بیڈ پر نظریں جھکائے بیٹھی اپنی دلہن کو دیکھنے لگا۔اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "اشمیرا۔۔۔۔"

اس کے منھ سے اشمیرا نام سن کر اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں اٹھائی اور حیرانی سے عارض کو دیکھا۔

"تم یہاں کیسے آئی؟" اس کے سوال پر وہ بولی۔

"جی؟ میں سمجھی نہیں۔" وہ اور بے قرار سا ہو کر بولا۔

"عنایہ کہاں ہے؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ پریشان سی ہو کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟" عارض کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔" میں نے کہا عنایہ کہاں ہے؟"

جی میں ہی عنایہ ہوں آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"کیا؟۔۔۔تم۔۔۔۔عنایہ کیسے ہو سکتی ہو تم تو اشمیرا ہو نہ۔"

"جی اشمیرا تو صرف میری پھوپھو مجھے بلاتی ہیں آپ کو کیسے پتہ یہ نام؟"

عارض حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے بولا" مطلب کی عنایہ اور اشمیرا دونوں تمھارے ہی نام ہیں۔"

"جی میرا نام عنایہ ہے صرف میری پھوپھو مجھے اشمیرا بلاتی ہے کیونکہ انھیں عنایہ نام نہیں پسند اس لیے وہ بچپن سے ہی مجھے اسی نام سے بلاتی ہیں۔" عارض کے دل پر اتنا سکون طاری ہوا کہ وہ بیاں نہیں کر پایا البتہ عنایہ کی الجھن بڑھ گئی اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ عارض یہ سب کیا کہہ رہا ہے۔اس کی الجھن دیکھ کر عارض اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اُسے ایک خوبصورت سی انگوٹھی اپنے کرتے کی جیب سے نکال کر پہنائی اور کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمھیں ہی میری ہمسفر بنایا۔میرے بھائی حمزہ نے سچ کہا تھا۔جو ہو رہا ہے ہونے دو اگر تم میرے نصیب میں ہو تو دنیا کی کوئی طاقت تمھیں میرا ہونے سے روک نہیں پائے گی۔"

"جی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا آپ کس بارے میں کہہ رہے ہیں۔"

عارض نے اسے شروع سے آخر تک سارا قصہ سنایا۔تب ایسی داستان سن کر وہ حیران بھی ہوئی اور ہنسنے بھی لگی۔اس کی ہنسی پر وہ بھی ہنس پڑا اور خدا کا شکر بجالایا کہ اشمیرا اور عنایہ ایک ہی ہے۔شہر بھر تلاش کرنے پر وہ اُسے نہیں ملی پر آج خدا نے اس کی محبت کو اس کی دلہن بنا کر آج اس کے سامنے لا کھڑا کر دیا،اپنے آپ سے زیادہ خوش نصیب آج اسے اور کوئی نظر نہ آیا۔

□□□

Nilofar Sadiya
Block No.2/ 11Classic genrel Store,
Labour Colony, Nanded,
Waghala. 431602 (M.S)
Mobile No.8855009520,7709978280

ڈاکٹر اشرف آثاری

# وٹامن سی کی کمی اور خواتین

انسانی جسم مختلف چیزوں کا مرکب ہے گوشت، ہڈیاں، خون، جلد، پٹھے، رگیں وغیرہ اور پھر یہ اعضاء مختلف اجزاء کے خمیر سے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں کیلشیم، آئرن، فاسفورس، زنک، پروٹین اور دیگر دھاتیں نمکیات وغیرہ مناسب مقدار میں شامل ہیں۔ ان تمام اجزائے ترکیبی میں اعتدال کا نام صحت اور ان کی بداعتدالی یا کمی بیشی کو آپ موٹے طور پر بیماری بگاڑ یا مرض کا نام دے سکتے ہیں۔

کیلشم جسم کا ایک اہم جز ہے جو جسم میں موجود تمام ہڈیوں کی نشو نما اور مضبوطی کے لیے ضروری ہے بالغ خواتین کو ایک دن میں وٹامن سی کی 75 ملی گرام کی ضرورت پڑتی ہے۔ جبکہ مردوں کو 90 ملی گرام کی حاجت ہوتی ہے۔ یہ ضرورت مختلف حالتوں میں زیادہ بھی ہوسکتی ہے جیسے خواتین میں دورانِ حمل یا پھر شیر خوار بچوں کو دودھ پلاتے وقت وغیرہ۔

زنک انسان کے مدافعتی سسٹم اور ہاضمے کے لیے ضروری ہے اور خواتین کو یہ سات ملی گرام اور مردوں کو نو پوائنٹ پانچ ملی گرام روزانہ درکار ہوتا ہے۔

آئرن خون کے لیے ضروری ہے۔ خواتین کو اس کی 14.8 اور مردوں کو 8.7 ملی گرام روزانہ ضرورت پڑتی ہے۔

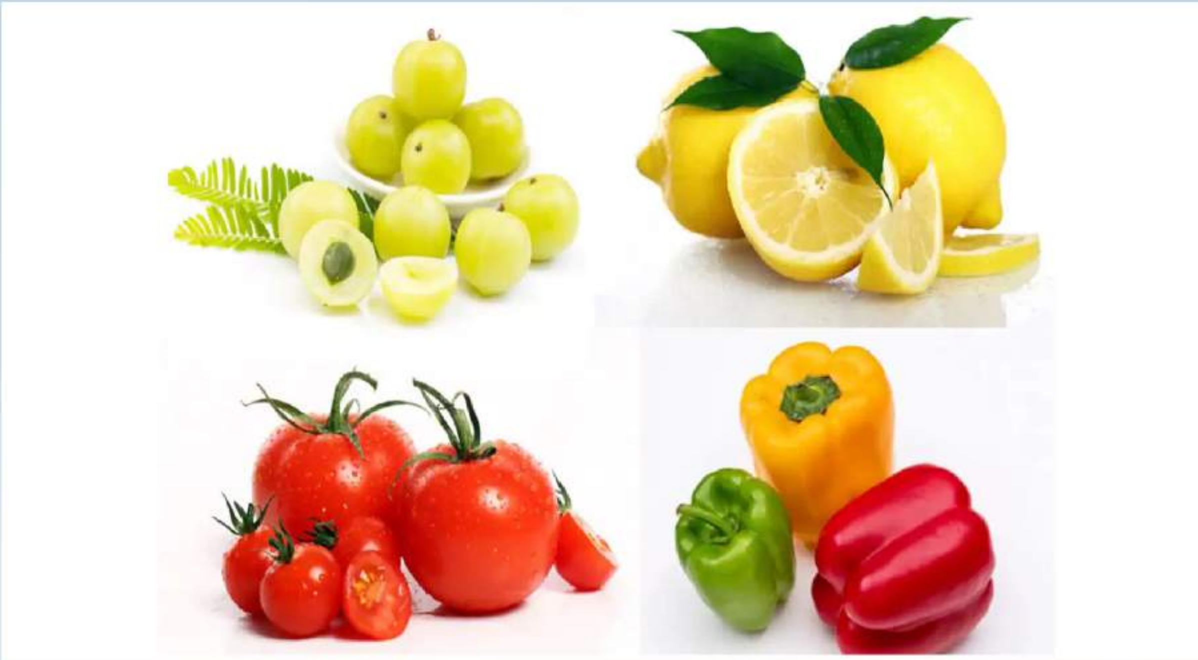

اگر آپ روزانہ اپنی جسمانی ضرورتوں کا خیال کر کے متوازن خوراک استعمال کریں تو اس میں یہ سب اجزاءمل جاتے ہیں۔اور اگر نہیں تو پھر آپ کو حسب ضرورت ان کے سپلیمنٹس لینے پڑینگے جو بازار میں تیار مل جاتے ہیں۔لیکن بہتر یہی ہے کہ یہ سب اجزاء آپ کو فطری طور پر آپ کے روزانہ استعمال میں آنے والی خوراک کے ذریعے سے ہی ملتی رہیں۔

تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ دنیا کی نصف آبادی روزانہ کسی نہ کسی طرح کے وٹامن یا حیاتین کی کمی کی صورت میں، نفع بخش گولیاں استعمال کرتی ہے۔اس طرح کے لوگ ان گولیوں کا استعمال جسمانی کمزوری یا پھر کسی بیماری کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کی صحت میں بہتری لائیں گی، انسان کو مکمل طور پر تندرست رہنے کے لیے کل 13 مختلف اقسام کے وٹامنز درکار ہوتے ہیں۔جن کی مناسب مقدار اس کی روزمرہ استعمال ہونے والی غذا میں شامل ہونی چاہیے۔

وٹامنز یا حیاتین عام طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فیٹ سولیوبل اور دوسرے واٹر سولیوبل، پہلی قسم جسم کے اندر جاتی ہے اور دوسری قسم، انسانی جسم، حسب ضرورت حاصل کر لیتا ہے اور اضافی مقدار خارج کر دیتا ہے۔یا پھر اگر اسے یوں کہا جائے کہ جسم اس زائد مقدار کو قبول نہیں کر لیتا ہے تو شاید مناسب ہوگا۔

فیٹ سولیوبلز میں وٹامن اے، ڈی، ای اور کے شامل ہوتے ہیں اس طرح کے وٹامن جسم میں ذخیرہ ہوتے جاتے ہیں لیکن ان کو زیادہ مقدار میں لینا صحت کے لیے مفید نہیں ہوتا۔

**واٹر سولیوبل وٹامنز:**

ان وٹامنز کو جسم کے اندر اسٹور نہیں کیا جاسکتا۔ان کا استعمال روزانہ کے حساب سے کرنا پڑتا ہے اور اگر انھیں ضرورت سے زیادہ لیا جائے تو یہ پیشاب کے ذریعے جسم سے خارج ہوتے ہیں تاہم ان میں وٹامن بی ایک ایسا وٹامن ہے، جو جگر میں جا کر جذب ہو جاتا ہے۔

**وٹامن سی کی کمی سے پیدا شدہ علامات:**

1۔مسوڑھوں کی سوجن اور خون آنا۔

2۔زخم نہ بھرنا۔

3۔جسم میں فولاد کی کمی۔

4۔جلد کی خشکی، قبل از وقت جھریاں نمودار ہونا۔

5۔ہر وقت تھکاوٹ کا رہنا اور بیمار پڑنا۔

6۔وزن بڑھ جانا۔

7۔جوڑوں کی تکالیف، درد اور سوجن وغیرہ۔

**وٹامن سی کی کمی کے وجوہات:**

ایسے افراد جو متوازن غذا کا استعمال نہیں کرتے، ان کے جسم میں عموماً وٹامن سی کی کمی ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ کچھ بیماریاں بھی ہیں جن میں مبتلا مریض وٹامن سی کی کمی کے شکار ہو جاتے ہیں۔مثلاً گردوں کے امراض میں مبتلا مریض جن کا ڈائیلاسز چل رہا ہو۔یا پھر نشہ آور چیزوں کے استعمال کے عادی لوگ، جیسے تمباکو چرس پینے والے وغیرہ۔ان کو وٹامن سی کی اضافی مقدار تقریباً 35 ملی گرام لینے کی ضرورت پڑتی

ہے۔ان کے جسم میں فری ریڈیکل پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لیے وٹامن سی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔

**وٹامن سی کی کمی کے علامات:۔**

وٹامن سی کی کمی کے علامات تین ماہ کے اندر اندر ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔مثلاً

**زخموں کا دیر تک ٹھیک نہ ہونا:۔** جب کسی شخص کو زخم لگتا ہے تو زخم کی وجہ سے اس کے جسم میں وٹامن سی کی کمی ہو جاتی ہے، جسم کو کولاجن بنانے کے لیے وٹامن سی درکار ہوتا ہے۔ یہ پروٹین ہوتی ہے جو جلد کی ٹوٹ پھوٹ کی اصلاح کرتی ہے۔وٹامن سی خون کے سفید ذرات رخلیے (Leucocytes) پیدا کرنے میں بھی معاونت کرتی ہے جو جسم کا نظام چلانے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔

**مسوڑھوں سے خون آنا یا نکسیر پھوٹنا:۔** وٹامن سی خون کی ترسیلی رگوں کو مضبوط و مستحکم کرنے اور خون کو مناسب سطح پر پتلا یا گاڑھا رکھنے میں بھی ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔کولاجن بنانے میں مدد دیتا ہے جس سے دانتوں اور مسوڑھوں کو درست رکھنا ممکن بن جاتا ہے۔ایک تحقیق کی رو سے جو مریض مسوڑھوں سے خون آنے کے مرض میں مبتلا تھے، دو ہفتوں تک وٹامن سی سے بھرپور پھل اور سبزیاں کھانے سے ٹھیک ہو گئے اور ان کے مسوڑھوں سے خون آنا بند ہو گیا۔

**موٹاپا:۔** ایک حالیہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وٹامن سی کی کمی اور جسم میں چربی کا اضافہ، بالخصوص پیٹ کی چربی چڑھنے میں، جسم میں موجود وٹامن سی کی مقدار کا باہمی ربط ہے۔وٹامن سی کی وجہ سے جسم کی اضافی چربی پگھل جاتی ہے اور جسم کو طاقت و توانائی حاصل ہو جاتی ہے۔

**جلدی امراض:۔** وٹامن سی کی کمی کے باعث جلد کو بھی متاثر ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔وٹامن سی کی حسب ضرورت مقدار لینے سے چہرہ تروتازہ اور نرم و ملائم رہتا ہے اور اس کی رونق بحال رہتی ہے، وٹامن سی جسم کی جلد کی ٹوٹ پھوٹ کو بھی درست کر دیتا ہے وٹامن سی سے ہی جلد خراب خلیوں اور فری ریڈکلز سے محفوظ رہتی ہے۔

**قوتِ مدافعت اور وٹامن سی:۔** یہ بات مسلم ہے کہ جسمِ انسانی میں بیماریوں سے لڑنے کے لیے قوتِ مدافعت کا مضبوط ہونا بہت ضروری ہے خاص طور پر آج کے وبائی امراض کے دور میں، آج کل پوری دنیا میں Covid-19 کی مارا ماری چل رہی ہے، ابھی تک اس کا خطرہ مکمل طور پر ٹلا نہیں ہے اور دنیا کے تمام ممالک میں اس کا اثر دیکھا جا رہا ہے۔عوام اور حکمران اس سے پریشان اور سہمے ہوئے ہیں اور چھٹکارا پانے کی کوشش میں مصروف عمل بھی ہیں۔اس ضمن میں دنیا بھر کے طبی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ Covid-19 سے بچنے کے لیے خاص طور پر، قوتِ مدافعت کو مضبوط و مستحکم بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ جس کے لیے ہر جگہ

وٹامن سی والی اشیاء کے وافر مقدار میں استعمال کو ترجیح مل رہی ہے اور وٹامن سی کی ٹکیاں بھی دی جارہی ہیں۔وٹامن سی کی ،جسم میں حسبِ ضرورت مقدار میں موجودگی ،نمونیہ،امراضِ مثانہ،امراضِ قلب، جلدی امراض یہاں تک کہ کینسر جیسے موذی مرض کہن سے بھی نجات کا باعث بن سکتی ہے۔

**تھکاوٹ وذہنی پریشانی:**۔ جدید سائنسی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ وٹامن سی کی کمی سے پورے جسم میں تھکاوٹ کا احساس ہوجاتا ہے۔جس کے ساتھ ہی چڑ چڑاپن، مایوسی اورڈیپریشن وغیرہ بھی ہوتا ہے۔جبکہ ان افراد میں، جن کے جسم میں وٹامن سی کی مناسب مقدار موجود ہو، وہ ایسا محسوس نہیں کرتے بلکہ ان کا اپنے جسم اور ذہن پر اچھا خاصا کنٹرول رہتا ہے۔

**ضعفِ بینائی:**۔عام طور پر عمر بڑھ جانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی بینائی بھی کمزور ہوجاتی ہے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے وٹامن سی اور کچھ اینٹی آکسیڈنٹس معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں، وٹامن سی کی مناسب مقدار اپنے روزمرہ کھانے میں شامل کرنے سے آنکھوں میں موتیابند پیدا نہیں ہوسکتا اس ضمن میں ابھی اور تحقیق چل رہی ہے۔

**مرضِ اسقربوط:**۔اسقربوط دراصل دانت گرنے، یا ناخن ٹوٹنے، جوڑوں میں درد ہونے، ہڈیوں کے ڈھیلا پڑنے، بال جھڑنے جیسی علامات سے پیدا ہوجاتا ہے۔ان امراض میں مبتلاء مریضوں کو وٹامن سی کھلانے سے قابلِ قدر فائدہ ہوجاتا ہے اور وہ شفاء کی طرف لوٹ جاتے ہیں اس لیے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وٹامن سی کی کمی سے ہی یہ بیماریاں بھی پھیلتی ہیں۔

**آخری بات:**

مختصراً یہ کہ وٹامن سی کی کمی کے باعث بہت ساری بیماریوں کا پھیلاؤ مشاہدے میں آیا ہے جس سے بلالحاظ جنس، عمر، اور رنگ ونسل پوری انسانی برادری متاثر ہوسکتی ہے خواہ وہ بچے ،نوجوان، بوڑھے ہوں یا مرد یا خواتین ۔البتہ بچوں اور خواتین کا خیال اس لیے زیادہ رکھنا ضروری ہے کہ بچوں کو قوم کا معمار کہا جاتا ہے اور خواتین ان معماروں کو جنم دینے والی مائیں ہوتی ہیں جو جتنی طاقتور ہونگیں قوم کے یہ ننھے معمار بھی اتنے ہی طاقتور اور مضبوط وتندرست ہوں گے۔خواتین کا خیال اسلیے بھی زیادہ رکھا جانا چاہیے کہ انھیں دورانِ حمل متوازن غذا کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے اور پھر جب وہ بچہ جننے کے بعد شیر خوار بچے کو دودھ پلاتی ہوں تو ان کے جسم میں، کیلشیم کی ضرورت بہت بڑھ جاتی ہے۔شیر خوار بچوں کی ہڈیاں مضبوط ہوں اور خود انھیں بھی کیلشیم کی قلت سے پیدا شدہ صورتِ حال سے نہ گزرنا پڑے۔اس لیے اس بنا پر ہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ خواتین کو مردوں کی نسبت کیلشیم کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے جو انھیں تازہ سبزیوں پھل دودھ اور دیگر خوردنی اشیاء سے روزانہ کی بنیاد پر حاصل کرتے رہنا چاہیے۔

□□□

**Dr. Ashraf Asari**
Sudrabal, Hazratbal
Srinagar-190006 (Kashmir)
Mob: 9419017246, 77780963728

# مراسلہ

''خواتین دنیا'' جون 2023ء نظر نواز ہوا۔ لگتا ہے کہ ایسے پرکشش سرورق آپ دلنوازی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ زیرنظر شمارہ کا سرورق یا کسی دیکھ کر ذہن کچھ ایسے خیالات کا آماجگاہ بن گیا کہ جیسے کوئی تھکی ہاری خاتون نسل انسانی پر بے لوث احساسات نچھاور کر کے اپنے وجود تک کو وارنے کے لیے بھی مستعد کھڑی ہے۔ اس تمام تر نظارے کو دیکھ کر ذہن میں ایک غزل تڑپ رہی ہے۔ آپ بھی سنئے۔

یہ اداس اداس ٹھنڈک جو اسیر ہے پون میں
کہیں بجلیاں نہ بھردے کسی گوشۂ چمن میں
سرِ دار بھی پکارا لبِ بام بھی صدادی
میں کہاں کہاں نہ پہنچا تیری دید کی لگن میں
میں لیے لیے پھرا ہوں غم زندگی کا لاشہ
کبھی اپنی خلوتوں میں کبھی تیری انجمن میں
مری مفلسی سے بچ کر کہیں دور جانے والے
یہ سکون نہ مل سکیگا تجھے ریشمی کفن میں

مزید برآں اس منتخب شمارہ میں کوئی آٹھ اصناف سخن ہیں اور ان کے تیئں کوئی 16 ابواب ہیں جن کی تفصیل یوں ہے۔ ''مشعل'' (ص4) جس میں یہ درس دیا گیا ہے کہ خواتین کی فلاح کے لیے ان کی صحت کے تیئں بیداری کے علاوہ ہمیں ان کے لیے بہتر امکانات، اچھا گھر، پرسکون خاندان اور صحتمند معاشرے کی فکر از حد ضروری ہے۔ یہ نہ صرف مشعل راہ ہے بلکہ فلاحی فکرمندی ہے۔ شخصیت (ص5 تا 8) کے ذیل

میں خواجہ عبدالمنتقم صاحب نے ''کانتا گرور شبنم کے کلام میں تقسیم ہند اور جذبۂ حب الوطنی'' کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں خاص نکتہ یہ ہے کہ بہت سی مسلم شاعرات کے ساتھ ساتھ ہندو شاعرات بھی گمنامی کا شکار رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ کو تو ایک قلیل عرصہ تک یاد رکھا گیا لیکن بعد میں انھیں یکسر فراموش کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا ضمناً بھی ذکر نہیں ہوتا۔ اس لیے ان میں کچھ کا کلام مذکور ہے۔ ''شاعرات کے منتخب اشعار'' (ص9) میں سات شاعرات کا منتخب کلام مذکور ہے۔ سبھی فی الواقعی منتخب ہیں۔ خصوصاً پوجا بھاٹیا، پروین شیر، راحت سلطانہ وغیرہ خوب رہے۔ ''جہانِ نسواں'' (ص10 تا ص42) میں کوئی سات مقالے درج ہیں۔ پہلا مقالہ محترمہ ڈاکٹر روحی فاطمہ کا مضمون ''معاشرہ کی ترقی میں ریاضی کا کردار'' کافی ندرت لیے ہوئے ہے۔ اس میں پہلے تو ریاضی کا مفہوم واضح کیا گیا اور اس کے معاون نکات جیسے ریاضی کی اہمیت، ترقی، بدلتی دنیا میں ضرورت اور معاشرہ میں اس کے کردار سے بحث کی گئی ہے۔ ریاضی کسی بھی قوم کو مظلومیت سے محفوظ رکھتی ہے اور آنے جانے والی مصیبتوں کو ٹال سکتی ہے۔ بڑا لاجواب مضمون ہے۔ والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کو اسے ازبر کرائیں سارے مضامین کمزور ہو سکتے ہیں لیکن ذرا سی محنت سے ریاضی کبھی نہیں۔ بقیہ مضامین پر بھی چیدہ چیدہ موضوعات پر زور دیا گیا ہے۔ اس لیے ٹھیک ہی تو ہیں۔ ''حسن سخن'' (ص43 اور 44) میں ڈاکٹر قدسیہ انجم کی دو غزلیں بہت خوب ہیں۔ ذاکرہ شبنم صاحبہ کی نظمیں بھی بھلی لگیں۔ ''افسانہ'' (ص45 تا58) میں تین اچھے افسانے دیے گئے ہیں لیکن شکیلہ نگار صاحبہ کا افسانہ ''دو آنکھیں'' اچھوتا اور ندرت لیے ہوئے ہے۔ ''صحت'' (ص59 تا 61) کے تحت ڈاکٹر بشریٰ اشرف نے ''خواتین اور ان کے نفسیاتی مسائل'' پر بحث کی ہے۔ اس میں ایک خاصیت یہ ہے کہ ذہنی الجھن کے مسائل کی اس بحث کے دوران بھارتی مریض مرکوز رہے۔ ''قارئین کے خطوط'' (ص62) ایک ہی منتخب مراسلہ دیا گیا ہے۔ اس خوبرو شمارہ کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کے ان دشوار کُن ایام میں ''خواتین دنیا'' کے مطالعہ سے تلخی ایام میں اک سہارا، اک سکون سا میسر ہوتا ہے۔ بقول فیض:

اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حسن کے نام

**مصطفیٰ ندیم خاں غوری**، زرّین ولا، بی-II، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹر) 431001

یہ رسالہ بڑوں کے ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ اس میں سبھی کہانیاں اور مضامین عمدہ اور قابل تعریف ہیں۔ سبھی قلمکاروں کو مبارکباد۔

**بشن چودھری**، منڈی گوبند گڑھ، پنجاب

''ماہنامہ خواتین دنیا'' جولائی 2023 موصول ہوا۔ این سی پی یو ایل کے ماتحت نکلنے والے 4 میگزین کا سالانہ خریدار ہوں لیکن ڈاک کی بدنظمی کے سبب رسائل باقاعدگی سے نہیں ملتے۔ تازہ شمارہ آپ کی محنت اور کاوش کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اداریہ سے لے کر قارئین کے خطوط تک مطالعہ کیا۔ تمام تخلیقات قابل تعریف ہیں۔ خاص کر شاہینہ پروین نے "سلسلہ رباعیات" کے گوشے میں ڈاکٹر اسلم پرویز کی شخصی رباعیات کا تنقیدی جائزہ جس فنی انداز اور چابکدستی سے پیش کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ صاعقہ غیاث نے افسانہ "مورت" میں موجودہ سماج کی بے حسی اور مفلسی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہے۔ کہانی نے دل و دماغ پر ایک گہرا اور دیرپا نقش چھوڑا۔ اس سےقبل بھی اکتوبر 2022 کے شمارے میں افسانہ "ہوا کی زد پہ" پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے افسانے پڑھ کر ناچیز کو بھی لکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

**محمد گلزار عالم**، ریل پار، جہانگیری محلّہ، آسنسول، مغربی بنگال

''خواتین دنیا'' جولائی کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔

سرورق دیدہ زیب تو ہے معنی خیز بھی ہے۔ زمین، پودے، پرندے اور ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے عورت۔ قدرت کے یہ چاروں مظاہر زندگی کی بقا کے ضامن ہیں۔ رہی سہی کسر آپ کے اداریے نے پوری کردی۔ ماحولیاتی آلودگی کو لے کر نہ جانے کب سے دہائی دی جا رہی ہے۔ لیکن ضرورت اور ہوس نے انسان کو اپنا ہی دشمن بنا رکھا ہے۔ مشمولات میں رباعی پر دو خوبصورت مضامین ملے۔ اسے حسن اتفاق کہوں یا حسن نظر کہ ایک شاہینہ پروین کی مرہون منت دوسرا خوشبو پروین کی۔

کہانیوں میں مورت اچھی لگی۔ تقریب میں زندہ لوگوں کو مورت بنا کر کس کی دل لگی کا سامان کیا جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن بے حس اور پتھر دل ہونے کا اعلان ضرور ہو جاتا ہے۔ دوسری کہانی مقابلہ بڑے کینوس کی چیز ہے۔ آج روزگار دینے کے نام پر کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں، وہی جانتے ہیں جن پر گزرتی ہے۔

**فیروزا احمد**، کولکاتہ

□□□

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## انیس کے مرثیے (جلد اوّل و دوم)

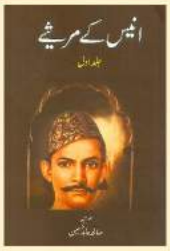


مرتبہ: صالحہ عابد حسین

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 504 (جلد 1)، 612 (جلد 2)

قیمت: 250 (جلد 1)، 275 (جل 2)

## تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

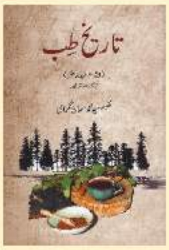


مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

## آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

## دنیا کی بہترین کہانیاں

انتخاب و ترتیب: گنگا پرساد ول

مترجم: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

## نظری تنقید: مسائل و مباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

## تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

## تشریح البدن (جلد سوم)

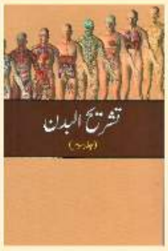


ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

## انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 514

قیمت: 235 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अगस्त – २०२३ वर्ष:७, अंक: ८

**Mahnama Khawateen Duniya Monthly August 2023 ,Vol. 7, Issue: 8**

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

**RNI. No. DELURD/2017/74026**
**DL (S)-17/3555/2021-23**
**ISSN 2581-4826**
**Date of Publication: 13-08-2023**
**Date of Dispatch : 14 and 15 of every month**
**Total Pages: 64**

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

# اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

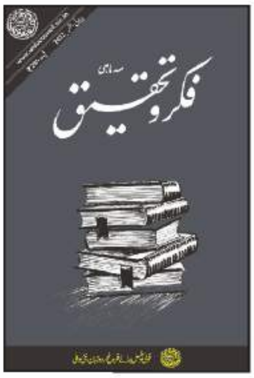

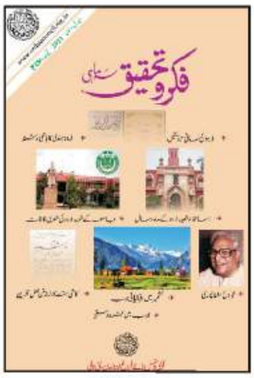

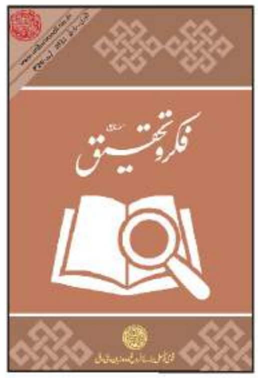


قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in، پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025